انتخابات زبان اردو

الموسوم بہ

توزک اردو

مؤلفہ

مولوی محمد اسمٰعیل

سابق مدرس فارسی گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ

مجوزہ

جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتہ تعلیم

صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ

برائے درس جماعتہائے اپر مڈل یعنی ہفتم و ہشتم اینگلو ورنیکولر اسکولز

باہتمام کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ

نول کشور پریس

حضرت گنج لکھنؤ

سنہ ۱۹۲۰ء

تنصیف شدہ قیمت ۹/

بار ہشتم

TO

THOMAS ROWLAND WYER, Esq., B. A. J. P.,

Officiating Commissioner, Rohilkhand Division,

FORMERLY MAGISTRATE & COLLECTOR, MEERUT,

who has given an impetus to HIGHER EDUCATION in the Meerut Division by founding a College at its headquarters

AND

Who has Organized, Expanded and Improved

THE MIDDLE & PRIMARY EDUCATION

IN

SOME OF THE DISTRICTS OF THE DIVISION.

THIS BOOK IS INSCRIBED

As a mark of Admiration for his Indefatigable Labours and Vast Sympathy for the Natives.

BY

THE COMPILER.

Lucknow:

PRINTED BY K. D. SETH, AT THE NEWUL KISHORE PRESS.

1919.

دیباچہ

زبان اُردو کی کم مائگی مُسلم ہی سہی - تو بھی یہ عذر اِنتخاب کی ذمہ داریوں سے ہم کو چنداں سبکدوش نہیں کرتا - جو سبق طلبہ کے درس ذمطالعہ کے لئے پیش کیے جائیں وہ بالضرور فصاحت و بلاغت میں کامل عیار - ادب و اخلاق کی میزان میں سنجیدہ و لآویزی و شگفتگی کے آب و نمک سے بامزہ ہونے چاہئیں -

کامیابی کا دعویٰ تو نہیں مگر ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ مضامین منتخبہ میں حُسنِ ظاہر کے ساتھ معنوی پاکیزگی بھی ضرور ہو - زباندانی بیشک ایک جوہر ہے - مگر جس زبان سے قوائے روحانی مضمحل ہو جائیں - اُس سے تو بے زبانی ہی بمراتب بہتر ہے -

نثر اُردو نے نظم سے بہت پیچھے رواج پایا ہے - اُس کی ابتدا قصہ کہانیوں سے ہوئی اور تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا - کہ تصنع اور تکلف نے اُس کو بیکار محض کردیا - مگر مرزا غالب مرحوم کی تحریرات سادہ و سرسری نے اُس کا قدرتی حُسن دکھایا - پھر سرسید مرحوم اور اُن کے مقلدین نے مغربی خیالات کی جان ڈال کر اُس میں مہذب زبانوں کی سی آن و ادا پیدا کردی - اگرچہ قابل اِنتخاب قریب تر زمانہ کی نثر ہے - مگر ہم نے مشاہیر قدیم و جدید سب کے کلام کا نمونہ لیا ہے - تاکہ طلبہ کو مختلف اسالیب بیان سے واقفیت حاصل ہو -

اصناف نظم میں تو ہمارے شعراے سخن سنج نے شیوا بیانی اور آتش زبانی کی دھوم مُدت سے مچا رکھی ہے اور ریختہ کو رشک پارسی بنانے میں کسر نہیں چھوڑی لیکن اس سیمیائی باغ میں سے ایسے گل پھول چُننا - جو نوخیز طبائع کو آشفتہ اور جذبات نفسانی کے بھوت کو بیدار نہ کردیں - سخت مشکل کام ہے - بارے ہم نے اِس طلسم کدہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھا اور اساتذہ ماضی و حال کے پاکیزہ کلام کے اِس مجموعہ کو زیب و زینت دی - اُمید ہے کہ اِس انتخاب کے مطالعہ سے مہارت زباندانی کے علاوہ طلبہ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اُردو کی نظم و نثر نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ میں کیا کیا منزلیں اپنی ترقی کی طے کی ہیں - مارچ ۱۸۹۰ء

محمد اسمٰعیل

فہرست مضامین توزک اُردو

حصۂ نثر

حصۂ نظم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حصّۂ نثر

آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں کے سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی

ولادت ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ وفات ۲۷۔ مارچ ۱۸۹۸ء۔ سر سیّد نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کی بنیاد ڈالی۔ اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ اور رسالۂ تہذیب الاخلاق دونوں اُن کی اڈیٹری میں نکلتے تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سب سے زیادہ مشہور تفسیر القرآن ہے چھ جلدوں میں ان کا طرز تحریر سادگی و روانی و دلنشینی میں مشہور ہے۔ تکلف نام کو نہ تھا۔ مشکل سے مشکل مضمون کو اِس خوبی سے بیان کرتے کہ گویا پانی کرکے بہا دیتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو زبان کے علم ادب میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی لٹریچر کا پرتو اُس پر پڑا۔ وہ زیادہ تر سر سید ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اِس لئے اُن کو جدید علم ادب کا بانی کہہ سکتے ہیں۔

سولزیشن یا تہذیب (از تہذیب الاخلاق)

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں۔ کہ سولزیشن کیا چیز ہے؟ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اِس کو پیدا کیا ہے؟ اِس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے؟ جسے لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مُقرر کیا ہے۔ یا ایسی چیز ہے کہ اُس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اُس کا تعلّق ہے وہ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اِس امر کے تصفیہ کے لئے ہم کو انسانی حالات پر نظر کرنی چاہیئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ تو وحشیوں میں

شہریوں میں۔ سب میں اُس کا نشان ملے گا۔ گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں اِلّا سب کی جڑ ایک ہی ہو گی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے۔ کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی کو بُرا۔ اور اُس کی طبیعت اِس طرف مائل ہے کہ اُس بُری چیز کی حالت کو۔ ایسی حالت سے تبدیل کرلے۔ جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے۔ جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اِسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں۔ کہ یہ میلان یا یہ خواہش مُبادلہ انسان میں قدرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اُصول ٹھہرے۔ اچھا اور بُرا۔ اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خُلقی۔ مُلکی اور تمدّنی ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہراتے ہیں۔ یا یوں کہو۔ کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے۔ دوسری قوم اُسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔

جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے۔ تو اکثر اُن کی

ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں۔اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات۔ اُن کی مسرت کی باتیں اور اُن کی نفرت کی چیزیں۔سب یکساں ہوتی ہیں۔ اور اِسی لئے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب میں یکساں پیدا ہوتے ہیں۔ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے۔ اور یہ ہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اُس قوم یا گروہ کی سِولزیشن ہے۔ مگر جب کہ مختلف گروہ مختلف مقامات میں بستے ہیں تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی۔ کہ جو سِولزیشن کی اُن مختلف حالتوں کا تصفیہ کرسکے*

مُلکی حالتیں جہاں تک کہ بودوباش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر و خیال و دماغ سے اُن کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اُس سے تعلق ہے۔جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہراتا ہے۔اور جس کے باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے۔ اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے۔ جو سِولزیشن کہلاتا ہے۔پس سِولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کرسکتے ہیں۔جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے خیال کی درستی اور پسندیدگی صحتِ کثرت معلومات اور علم طبعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ اِنسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ سِولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے؟

کہ آیندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو۔ کہ اِس زمانہ کی تہذیب کو بھی۔ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دِل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنوں سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدّب دل سے دیکھتے ہیں ✤

تہذیب یا یوں کہو۔ کہ بُری حالت سے اچھّی حالت میں لانا دُنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادّی یکساں تعلّق رکھتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہُنر اور اُس کو ترقّی دینا تمام دُنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زرو جواہر۔ یاقُوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوب صورت زیور بناتی ہے۔ نا تربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پُوتھوں سے اپنی آرایش کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں۔ سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ نا تربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پَروں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سُنہری پوست اور زمرّد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی دُرستی کا خیال ہے۔ نا تربیت یافتہ بھی اُس کی دُرستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں۔ اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ نا تربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور اُن کے رہنے کے گھونپے درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈ۔ زمین

میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں تمدّن کے قاعدے عیش اور عشرت کی مجلسیں۔ خاطر و مدارات کے کام اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات سے بھی نا تربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں اُن میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ نا تربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر نا تربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ اُن کی ادا اور آواز کی پھرت۔ اُس کا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ۔ اُس کا ٹھہراؤ اور اُس کی اُتیج۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر نا تربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لَے اور تال اور راگ راگنی کو نہیں جانتے۔ مگر دِل کی لہر اُن کی لَے۔ اور دل کی پھڑک اُن کا تال ہے۔ اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا طبعی حرکت کے ساتھ اُچھلنا۔ دل کی بے تابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو نزاکت اور فن خنیا گری سے خالی ہو۔ مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دِلی جذبوں کا روکنا اور اُن کو عُمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے

پس جس طرح ہم تہذیب کا قُدرتی لگاؤ تمام اِنسانوں میں پاتے ہیں۔ اُسی طرح اُس کا تعلّق عقلی اور مادّی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں جس چیز میں ترقی یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہوسکتی ہے اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے *

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے ؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور اُن کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق۔ معاملات معاشرت۔ طریق تمدّن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطری عمدگی پر پہونچانا اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اِس کا نتیجہ کیا ہے ؟ روحانی خوشی۔ جسمانی خوبی۔ اصلی تمکین۔ حقیقی وقار۔ اور خود اپنی عزّت کی عزّت۔ اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے *

(سیّد احمد خاں)

عزّت

(از تہذیب الاخلاق)

بہت کم لوگ ہیں۔ جو اِس کی حقیقت جانتے ہوں۔ اور بہت کم ہیں جو اِس کے مستحقات کے معزز القابوں کے مستحق ہوں۔ جس کی لوگ بہت آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اُسی کو لوگ معزز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بھی معزز جانتا ہے۔ اوصاف ظاہری بھی ایک ذریعہ معزز ہونے اور

معزّز بننے کا ہے۔ جو دولت۔ حکومت اور حشمت سے بھی زیادہ معزّز بنا دیتا ہے مگر یہ اعزاز اِس سے زیادہ کچھ رُتبہ نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا ملمّع کر دیا گیا ہو۔ جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہ ہو۔ اُس وقت تک درحقیقت وہ کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب تک اُس کی حالت عزّت کے قابل نہ ہو۔ وہ مُعزّز نہیں ہو سکتا۔

لوگوں کو کسی انسان کی اندرونی حالت کا جاننا نہایت مشکل بلکہ قریب ناممکن کے ہے۔ پس اُن کا کسی کو معزّز سمجھنا درحقیقت اُس کے معزّز ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ ہاں وہ شخص بلاشبہ معزّز ہے جس کا دل اُس کو معزّز جانتا اور معزّز سمجھتا ہو۔ جس کو انگریزی میں سیلف رسپیکٹ کہتے ہیں کوئی شخص کسی سے جھوٹی بات کو سچّی بنا کر کہتا ہے۔ تو خود اُس کا دل اُس کو ٹوکتا ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ گو سُننے والا اُس کو سچ سمجھتا ہو مگر کہنے والے کا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا اور بے عزّتوں میں کا ایک بے عزّت ہے۔

اِسی طرح تمام افعال انسان کے۔ جو صرف ظاہری نمائش کے طور پر کیے جاتے ہیں۔ گو لوگ اُن کی عزّت کرتے ہوں۔ مگر درحقیقت وہ عزّت کے مستحق نہیں ہیں۔ عزّت کے لائق وہی کام ہیں۔ جن کو دِل بھی قابلِ عزّت سمجھے۔ اِس لئے انسان کو اِنسان بننے کے لیئے ضرور ہے کہ تمام اُس کے کام سچّائی اور دلی شہادت پر مبنی ہوں۔ ہم کوئی

بات ایسی نہ کہیں جس کو ہمارا دل جھٹلاتا ہو۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کی عزت ہمارا دل نہ کرتا ہو۔ کسی سے ہم اظہار دوستی اور محبت کا نہ کریں۔ اگر درحقیقت ہمارے دل میں۔ اُس سے ویسی ہی محبت اور دوستی نہ ہو۔ جیسی کہ اظہار کرتے ہیں۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کو ہمارا دل اچھا نہ سمجھتا ہو ✤

" صلاحِ کل ہونا" اگر اِس کے معنی یہ ہوں۔ کہ سب سے اِس طرح ملیں کہ ہر شخص جانے۔ ہمارے بڑے دوست ہیں۔ تو یہ تو نفاقِ اکبر ہے۔ ایسا شخص نہ کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی اُس کا دوست ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے یہ معنی ہوں۔ کہ کسی سے بغض۔ عداوت اور دشمنی اپنے دل میں نہ رکھے کسی کا بُرا نہ چاہے۔ دشمن کی بھی بُرائی نہ چاہے۔ وہ بلاشبہ تعریف کے قابل ہے۔ دل اِنسان کا ایک ہے اُس میں دو چیزیں یعنی عداوت (کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو) اور محبت سما نہیں سکتی۔ وہ ایسی کُلھیا نہیں ہے۔ جس میں دو خانے ہوں۔ ایک محبت کا۔ ایک عداوت کا۔ اور اِس لئے یہ دو چیزیں گو اشخاص متعدد اور حیثیات مختلفہ کے ساتھ کیوں نہ ہوں۔ دِل میں سما نہیں سکتیں۔ اِس لئے اِنسان کو لازم ہے کہ محبت کے سوا کسی دوسری چیز کے لانے کا دل میں خیال ہی نہ کرے۔ اور ایسی ہی زندگی انسان کے لئے عُمدہ زندگی ہے۔

(سیّد احمد خاں)

نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خان منیر نواز جنگ

(از تہذیب الاخلاق)

(موجودہ تعلیم و تربیّت کی شبیہ)

ایک روز خیال نے مجھے عالمِ مثال تک پہنچایا۔ اور اُس طلسم کدہ کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مُصوّرِ قدرت نے کھینچ رکھی ہے۔ دِکھایا۔ درحقیقت میں نے اُسے ویسا ہی پایا جیسا کہ سُنا کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مُرقّع ہے ؛

جب مَیں اُس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا۔ تو ایک چار دیواری دیکھی۔ جو میرے خیال سے بھی زیادہ بلند اور میرے حوصلہ سے بھی زیادہ وسیع اور میری ہمّت سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ قدرت نے ایسا سُنہرا رنگ دیا تھا کہ جب سُورج کی کرن اُس پر پڑتی۔ تو وہ دیوار زرنگار کُندن کی طرح چمکتی جس سے آنکھوں کو چکا چوند ہو جاتی۔ اُس دیوار کے چاروں طرف پھرا۔ پر میں نے دروازہ نہ پایا۔ مگر ایک جگہ ایک بڑی نہر دیکھی۔ جو دیوار کے نیچے سے اندر جاتی ہے۔ اور ایک بلندی پر چشمہ دیکھا جس سے نہر میں پانی گرتا ہے۔

میں نے وہاں ایک رفیق پایا۔ جس کا نام خرد تھا۔ اُس سے حقیقت اُس کی پوچھی تو اُس نے کہا۔ کہ دراِس کے اندر ایک ایسا پُر فضا

باغ ہے۔ جسے جنتِ عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو۔ اور یہ نہر اُسی کے شاداب کرنے کے لئے بنائی گئی ہے"۔ تب تو مجھے جانے کا شوق ہوا اپنے رہنما سے دروازہ کا نشان پوچھا۔ اور مَیں نے اُس کی کامل اطاعت اور بڑی تابعداری کی تب اُس نے پانچ برس کے بعد دروازہ بتایا۔ مَیں اُس دروازہ کی محراب کی بلندی اور اُس کے طاق اور کنگرہ کی خوبی کیا بیان کروں! میں جاتے ہی بیتابانہ دوڑنے لگا۔ اور باغ کی سَیر سے سیر ہونا چاہا۔ میری اس بوالہوسی پر میرا رہنما ہنسا۔ اور کہا۔ کہ "اے نادان! دروازہ تو پانچ برس کی محنت کے بعد پایا۔ اس باغ کی سیر کیا آسان ہے! جس کا ایک کنارہ ازل اور دوسری حد لحد ہے"۔

خیر! میں نے ہوس کو روکا۔ اور خرد نے جس چال چلایا چلا۔ کئی برس کے بعد چند کیاریاں اُس باغ کی دیکھ پائیں۔ مگر اُن کی خوبی اور لطافت میرے بیان سے باہر ہے۔ ہر چمن قدرت کا کارخانہ اور صنعت کا تماشا تھا۔ اُس باغ کے سبزہ کا مستانہ جھومنا۔ قمری کی آواز۔ بُلبُلوں کا پھُولوں پر گرنا۔ پھُولوں کا کِھلنا۔ کلیوں کا چٹکنا۔ نرگس کی نظربازی اور شمشاد کی سرو قدی نے مجھے ایسا مست کر دیا کہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔

مَیں چندے اُس باغ میں رہا۔ پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ مِلا۔ جس سے دل بہلاتا۔ اور اُس باغ کی بہار لوٹتا۔ آخر اپنی تنہائی سے گھبرایا اور باہر نکلا کہ کوئی مجھ سا ملے۔ تو یہاں لاؤں اور اپنا

دِل خوش کروں ؂

میں اُس باغ سے نِکل کر برسوں اِسی تلاش میں پھرا لیکن کوئی نہ مِلا۔ آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی۔ جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی۔ نہر بھی ویسی ہی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا۔ جہاں سے میں نِکلا تھا۔ مگر دروازہ کھُلا ہوا، دیوار شکستہ اور کچھ نئی قسم کے آدمی آتے جاتے نظر آئے۔ میں نے اپنے رہنما سے پوچھا۔ کہ "یہ تو وہی باغ ہے۔ مگر کیا سبب ؟ کہ نہ دیوار کی وہ خوبی و خوشنمائی ہے۔ نہ دروازہ کی وہ رفعت و شان چشمہ بھی مَیلا نظر آتا ہے۔ پانی کی بھی صورت بدلی ہوئی ہے۔" اُس نے کہا۔ کہ "یہ وہ باغ نہیں ہے۔ دوسرا ہے۔ پہلے اُسی باغ کی طرح آراستہ تھا۔ خزاں کی ہوا نے اِس کو سُکھا دیا۔ اور زمانے کے انقلاب نے پامال کر دیا" ؂

جب میں باغ کے اندر گیا۔ تو چمن کے نشان کچھ نظر آئے۔ مگر نہ وہ صفائی۔ نہ وہ خوبی۔ نہریں بھی کچھ بہتی معلوم ہوئیں۔ مگر نہ پانی کی وہ لطافت۔ نہ وہ شیرینی۔ پھول جتنے تھے۔ سب کُمھلائے ہوئے۔ میوے جس قدر تھے۔ وہ سُوکھے پڑے ہوئے۔ سبزہ کے زمرّدیں رنگ پر سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ گُلوں کی سُرخی پر زردی آگئی تھی۔ نسیم کے بدلے صَرصَر کی تندی پریشان کرتی تھی۔ بُلبلوں کی جگہ زاغ و زغن کا شُور ہو رہا تھا نرگس اپنی پھُوٹی آنکھ سے حیرت کی نگاہ کر رہی تھی۔ حوض کی آنکھ اپنی خشکی پر رو رہی تھی۔

مَیں باغ میں پھرتے پھرتے نہر کے کنارے پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں ! کہ چند خوبصورت ماہرو نوجوان آئے۔ اور اُس نہر میں پانی پینے اور غوطہ لگانے لگے۔ جب وہ نہا دھوکر اُس سے نکلے۔ تو اُن کے چہرے بھدے ہوئے نظر آئے۔ نہ وہ شکل و شمائل تھی۔ نہ وہ نزاکت و نرمی۔ اور ہر ایک کے دو دو سینگ نکل آئے تھے۔ وہ نہر سے نکلتے ہی ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور سینگ سے سینگ لڑانے لگے۔ یہاں تک لڑے کہ کسی کا سینگ ٹوٹا کسی کا چہرہ بگڑا۔ کسی کا غصہ سے چہرہ لال ہوا کسی کا کف منہ سے اُڑکر مونچھ تک پہنچا۔ کسی کی گردن کی رگیں مارے غصہ کے تن گئیں۔ کسی کے منہ سے آواز غضب کے سبب سے نہ نکلی۔ اسی طرح وہ وحشیانہ لڑائی لڑتے ہوئے ایک عالی شان مکان کی طرف چلے میں بھی ساتھ ساتھ ہولیا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے ؟ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ ایک نصف وحشی نصف انسان جس کا چہرہ آدمی کا۔ دُم طاؤس کی۔ منہ چڑیا کا۔ پیٹ بیل کا۔ چال لومڑی کی۔ ایک رنگین سمور کی کھال اوڑھے ہوئے کبوتر کی طرح غٹرغوں کر رہا ہے۔ جب وہ سب نوجوان اُس کے پاس پہنچے۔ تو اُس کے آگے گر پڑے۔ اُس نے ایک کریہہ ہولناک آواز سے اُن کو پکارا۔ اور آپس کے جھگڑے کا حال پوچھا۔ اُن لوگوں نے کچھ ایسی بولی میں اُسے جواب دیا۔ کہ میں نہ سمجھا مگر یہ دیکھا کہ اُس وحشی آدمی نے کچھ خوش ہوکر کسی کا منہ چوما۔ کسی کو پیار کیا۔ اور کسی کو "مرحبا" کہا ؏

میں اِس مُعاملہ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اور پناہ مانگتا باہر نکلا اور اپنے رہنما سے اس اسرار کی خبر پوچھی۔ اُس نے کہا۔ کہ "اِس نہر کے پانی کی ایسی ہی تاثیر ہے۔ کہ سب ایسی شکل کے ہوجاتے ہیں جیسا کہ وہ نصف وحشی نصف انسان تم نے دیکھا ہے۔ یہ نوجوان۔ نازک۔ ماہرو لڑکے بھی جب زیادہ پانی پییں گے۔ خوب غوطے نہر میں لگائیں گے تو ایسے ہی ہوجائیں گے اور جو کچھ لڑائی تم نے دیکھی۔ یہ لڑائی نہ تھی۔ بلکہ ان کا علمی مباحثہ تھا۔ جس کے لفظ بھی تمھاری سمجھ میں نہ آئے"

جب میں نے اس تاثیر کا سبب پوچھا۔ تو رہنما مجھے چشمہ کے کنارے پر لے گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ چشمہ کے دہانہ پر دو چشمے آکر ملے ہیں ایک تو سیدھا چلا گیا ہے۔ جو کہ نہایت صاف۔ پاک۔ اور خوشگوار ہے۔ دوسرا خم و پیچ سے گیا ہے۔ جس میں جا بجا نالے ندیاں ملتی گئی ہیں۔ جو کہ سب کثیف میلی اور ناپاک ہیں۔ مگر پہلے چشمہ کے دہانہ پر ایک پتھر کی چٹان آگئی ہے۔ جس سے صاف پانی نہیں آسکتا اور دوسرا چشمہ کھلا ہوا ہے۔ اسی کا میلا بدبودار زہریلا پانی گرتا ہے۔ اور وہی باغ میں جاتا ہے۔ جس کی تاثیر سے آدمی مسخ ہوجاتے ہیں۔

جب میں نے اُن چشموں کا حال پوچھا۔ تو خرد نے تحقیق نامے رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ اِس کے ساتھ میں اُن دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا۔ مدت بعد سب حال دریافت کرکے اِس فکر میں پڑا۔ کہ اُس پتھر کی چٹان کا حال کسی سے پوچھوں۔ تب تاریخ

نامے ایک روشن ضمیر ملا۔ اُس نے کہا کہ "ہزار برس ہوتے ہیں تب میں اِس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تر و تازہ۔ سبز و شاداب تھا جیسا وہ باغ جو تم نے اول دیکھا ہے۔ اِس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا۔ اور گردے چشمہ پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب وہ صاف چشمہ پر آگیا ہے" ؎

تب تو میں نے خیال کیا۔ اِس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمّت کو ساتھ لے کر چلا۔ مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور پتھر سرکانے پر مجھے موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا میرے رہنما نے کہا کہ "اور بھی تیری طرح اِس ارادہ پر آئے مگر ان کے خوف سے بھاگ گئے۔ میں تجھے ایک مشعل دیتا ہوں جس کی روشنی سے یہ اندھے ہو کر بھاگ جائیں گے" چنانچہ بصیرت کی مشعل اُس نے مجھے دی۔ درحقیقت جب میں وہاں مشعل لے کر پہنچا۔ تو کوئی میرے پاس نہ آیا۔ آخر میں بفراغت پتھر سرکانے لگا۔ پر وہ ایک مجھ سے کب سرکتا تھا! میں تھک کر بیٹھ رہا۔ کہ ہمدردی نامے واعظ میرے سامنے آیا۔ اور کہا۔ کہ "مجھے اجازت دو۔ تو کچھ مدد کرنے والے لے آؤں" میں نے خوش ہو کر اُس کا شکر کیا۔ اور بڑے زور شور سے اُسے اپنی ہی صورت شکل والوں پاس بھیجا پر افسوس۔ کہ بہت کم لوگوں نے اُس کی بات سُنی۔ جو لوگ اُس نہر کا پانی پی چکے تھے۔ وہ تو مارنے کو دوڑے۔ اور جو لوگ ابھی اُس سے بچے ہوئے تھے اُن کے کان بہرے تھے۔ اُنھوں نے کچھ نہ سُنی۔ آخر وہ باحسرت

وہاں سے واپس آیا۔ اُس کے لَوٹنے کے بعد میں نے چاہا کہ اِس خیال کو چھوڑ دوں۔ اور یہ پتھر جیسا رکھّا ہے ویسا ہی رہنے دوں پر استقلال نام ایک رجز خواں نے میرا دل بڑھایا۔ اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اُس نے کہا "میں نے ایمان نام فقیر سے سُنا ہے۔ کہ اس چشمہ کا ایک کھودنے والا ہے۔ وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے اِنسان کی رسائی اُس تک ہو سکتی ہے۔ اُس کی راہ میں اوّل تو مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے۔ جہاں سوائے آنکھ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اُس سے بچ گئے۔ تو رسوائی و بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں تب دروازہ اُس کا ملتا ہے۔ جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ جو دُعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے۔ گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ برسوں نذر کی قبولیّت کی نوبت نہیں آتی پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے۔ تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اُس تک تمھاری رسائی ہوئی۔ اور اُس نے تمھاری نذر لے لی۔ تو وہ اقبال کو تمھارے ساتھ کریگا۔ جب تم اُس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے سب کی آنکھیں کھُل جائیں گی۔ جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجّب کرینگے اور تمھارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے۔ آخر چند ہی روز میں گدلے چشمہ کا پانی بند کر کے صاف

چشمہ کے پانی سے اپنی نہریں بھرلیں گے اور اپنے باغ کو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب کریں گے۔ تب یہ سوکھا ہوا باغ اُس ہرے باغ سے بھی تمھاری نظروں میں زیادہ سرسبز اور خوش نما معلوم ہوگا۔ کیونکہ نہ وہ باغ تمھارا باغ ہے۔ نہ وہاں کوئی تم سا ہے اور یہ باغ تمھارا ہی ہے اور سب تم سے ہیں۔ میں نے اُس رفیق کا شکر کیا اور اُس کے کہنے کے مطابق چلا۔ کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے؟

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصہ کہا۔ تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہہ کر(۱) کہ جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے۔ جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے۔ اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے۔ جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر آگیا ہے جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی۔ نیکی نما تعصب۔ علم نما نادانی۔ جھوٹا زہد۔ جھوٹی شیخی۔ جاہلانہ تقریر۔ عامیانہ غلامی۔ ضرر انگیز حرارت۔ وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے۔ جو کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے۔" چپ ہو رہا ❖

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

زبانِ گویا

اے میری بُلبُل ہزار داستان! اے میری طوطیِ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا۔ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے۔ جس کے سحر کا رد۔ نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعیِ جاں گداز ہے۔ جسکے زہر کی دارو۔ نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے اَدھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دِل دُکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی ؛

اے میری زبان! دُشمن کو دُوست بنانا اور دُوست کو دُشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جسکے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں ؛

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا۔ روٹھے کو منانا۔ اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بِس کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق ؛

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت۔ ہماری ذلت۔ ہماری نیکنامی ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اِس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا ؂

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں۔ مگر طاقت تیری نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ! اِس طاقت کو رائگاں نہ کھو۔ اور اِس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے۔ اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اِس جوہر کو برباد نہ کر۔ اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا ؂

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے۔ اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے۔ اور دِل اُسکا خزانچی۔ حوصلہ اُس کا قفل ہے۔ اور تو اُسکی کُنجی۔ دیکھ اِس قفل کو بے اجازت نہ کھول۔ اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے۔ اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صِفت ہے۔ اور مُرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا۔ اور اِس فرض سے جی نہ چُرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائیگا۔ اور تیری بساط میں صرف وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائیگا۔ کیا تجھ کو

یہ اُمید ہے۔ کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اُٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے۔ اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچّی زبان ہے تو زبان ہے۔ ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے۔ تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے۔ تو ہمارے مُنہ میں اور دوسروں کے دِلوں میں جگہ پائے گی۔ ورنہ گُدّی سے کھینچ کر نکالی جائیگی ؂

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور جو تیرا حکم بجا لائے۔ اُنھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچتائے۔ کسی نے اُنھیں فریبی اور مکّار کہا۔ کسی نے گستاخ اور مُنہ پھٹ اُن کا نام رکھّا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا۔ اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بنایا۔ اور کسی نے غمّاز۔ غیبت اور بہتان۔ مکر اور افترا۔ طعن اور تشنیع۔ گالی اور دُشنام۔ پھکّڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دُنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے۔ اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے ؂

اے زبان! یاد رکھ۔ ہم تیرا کہا نہ مانینگے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئینگے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑینگے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائینگے۔ ہم جان پر کھیلینگے۔ پر تجھسے جھوٹ نہ بلوائینگے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائینگے ؂

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں۔ کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھکر محبّت کے جوش میں آتا ہے۔ تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کُتّا جب پیار کے مارے بیتاب ہوجاتا ہے۔ تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سُبحان اللہ!

وہ نام کے جانور۔ اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار رہے۔ تو زبان راست گفتار دے۔ اور اگر دِل پر تجھ کو اختیار رہے۔ تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دُنیا میں رہیں سچّے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں۔ تو سچّے بن کر آئیں۔

(حالی)

حیات سعدی

شیخ کا نام۔ نسب۔ ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مُصلح لقب اور سعدی تخلّص ہے۔ سرگور اوسلی نے اُس کی ولادت ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء میں لکھی ہے۔ مگر وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تختِ شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنا تخلّص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخُدا اور متورع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم

نہیں کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عُمر میں یاد کرائے گئے تھے۔ اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت۔ شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت زیادہ کرتا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا شیخ نے اپنی تربیّت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے ؂

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقوےٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اِس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا۔ کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُس کے قرب و جوار میں عُلما اور مشائخ اور فُصحا اور بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جمِّ غفیر کا شہرہ جو خِطّۂ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے۔ بزرگوں سے سُنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے۔ یا اُن کی شُہرت اور ذکرِ خیر سُننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اِسی لئے تحصیلِ عِلم کا شوق اُس کو دامنگیر ہُوا۔ اگرچہ دار العلم شیراز میں تحصیلِ علم کا

سامان مہیا تھا۔ عُلمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول تھے۔ مدرسۂ عضدیّہ جو کہ عضد الدولہ دیلمی نے قائم کیا تھا۔ اور اُس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے۔ لیکن اُس وقت وہاں ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی۔ کہ اہل شیراز کو ایک دم اِطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل۔ رحم دل بامروّت اور فیاض بادشاہ تھا۔ مگر اُس کی طبیعت میں۔ اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کے حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی مُہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کردیتا تھا۔ اُس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مُفسد لوگ میدان خالی پاکر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کرکے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا۔ کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اِس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیلِ علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے۔ جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے۔

دلم از صحبتِ شیراز بہ کلّی بگرفت
وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم

سعدیا حبِّ وطن گرچہ حدیثی ست صحیح
نتواں مُرد بسختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ۔ میرا دل شیراز کی صُحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مُجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبّت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اِس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں سختی میں مَرا نہیں جاتا ؁

شیخ کے عام حالات

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج۔ قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اُس کے قویٰ کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے۔ کہ اُس نے دنش بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عُمر کا بہت بڑا حصّہ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا۔ اور ایک سو بیس۱۲۰ برس کے قریب عُمر پائی ؁

اُس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے۔ بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اِتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہلِ سلوک نفس شکنی کے لئے اپنے مشائخ کے اشارہ سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں۔ اُس نے بھی بیت المقدس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مدّت تک سقّائی کی تھی ؁

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے اُس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے۔ کہ وہ اِس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی۔ مگر آج کل

کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف۔ ایک نہایت بے تکلّف کھلاڈُلا۔ یار باش۔ ہنسوڑ۔ ظریف۔ ریا اور نمایش سے دور۔ سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریّت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلّف مقدّس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ مگر مشرق کے عام شُعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اُس نے مثل ظہیر۔ رشید خاقانی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مدّاحی اور امیروں کی بھٹی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ باایں‌ہمہ وہ اُمرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا۔ اور جو کوئی عقیدت یا محبّت سے اُس کی کچھ نذر کرتا تھا۔ وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے قصیدے ایسے ہیں۔ جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اُصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ امیروں سے وہ اس لئے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اُس کی سفارش سے (جیسا کہ گلستاں کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے) غریب آدمیوں کے کام نکلجاتے تھے ؎

خود داری اور غیرت اُس میں ایسی تھی۔ کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ جیسا کہ اسکندریہ کے قحط میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدائے تعالیٰ

نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اُس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اِس قدر مقبول نہ ہوتے۔ اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لئے وقف کردیا تھا۔ اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا۔ کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہوسکتا۔ جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں۔ ایک جوہر فطری۔ دوسرے زمانہ کے ایسے اتفاقات جو اُس کی جِلا کے باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی۔ اُسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا۔ جہاں ہونہار بچّوں کو خودبخود کسبِ کمال کی ترغیب ہونی چاہیئے۔ یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بےکسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رُشد کا باعث ہوئی ہیں ؎

جس مدرسہ میں وہ محسن اتفاق سے تحصیل علم کے لئے پہنچا۔ وہ[1] تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سربرآوردہ تھا۔ اور جس دارالخلافت میں وہ مدرسہ واقع تھا۔ وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریبًا تمام دُنیا کی سوسائیٹیوں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مہذب تھی۔ اُس نے صِرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ زمانہ نے بھی

[1] ۔ بغداد ۱۲

اُسکی تادیب خاطر خواہ کی تھی۔ اُس کی عُمر کا ایک بہت بڑا اور مفید حصّہ نہایت کٹھن اور دُور و دراز سفر کرنے اور دُنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیّرات۔ ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت میں راسخ ہوگئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کی آنکھوں کے سامنے بنے۔ اور بیسیوں بگڑ گئے۔ ایک بار جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے شام میں اُس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا۔ کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی۔ اور روستائی زادے وزارت کے درجے کو پہنچ گئے؎

ساتویں صدی میں۔ جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے اکیانوے برس بسر کیے تھے عجیب و غریب تماشے اُسکی نظر سے گذر گئے۔ سلاطین کردیّہ کا خاندان جن کی سطوت و جلالت۔ ایشیا۔ افریقہ۔ و یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی۔ اِسی صدی میں تمام ہوا سلاجقۂ قونیہ۔ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کر دیا۔ اسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرۂ خزر اور جھیل یورال سے دریائے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِسی صدی میں تاتاریوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اِسی صدی میں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہوئی۔ اور بقول بعض مؤرخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون

مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں ہے۔ اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب وصاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی۔ اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا۔ اِسی صدی میں واقع ہوے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اِسی صدی میں زوال آیا۔ دارالملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا۔ اسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا۔ فرقۂ اسماعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور و شور کے ساتھ حکمراں رہا۔ اُن کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور گردوں نے شام میں ہمیشہ کے لئے اسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے۔ جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ۔ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے۔ اُس میں کہتا ہے "خدا حمایت کرے اُس شخص کی۔ جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لئے تازیانہ ہے" یورپ کے مشہور مصنف ہگ ملر صاحب کا قول ہے۔ کہ "میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے۔ جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دل سوز اُستاد تھے"۔

(حالی)

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب شمس العلما ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

(از رویائے صادقہ)

ریاضتِ جسمانی

ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں جن میں سے اکثر بے سود و بے سود ہوں تو خیر! اُلٹے مضر۔ بداخلاقی کی تمہید۔ کاہلی کی تعلیم۔ اور بعض ہیں جو کچھ دماغی فائدے نکل سکتے ہیں۔ مثلاً گنجفے میں حافظے کی ترقی۔ چوسر شطرنج میں غور اور خوض کی عادت۔ تو اُنمیں بڑی قباحت یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں اُن سے مُطلق مدد نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص گنجفہ اچھا کھیلتا ہے۔ تو اُس کے یہ معنیٰ ہیں۔ کہ اُس کو پتّوں کی یادداشت اچھی ہے۔ لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا! صفحہ بلکہ دو چار سطریں بھی یاد نہیں ہو سکتیں۔ اِسی طرح بڑے سے بڑا شاطر شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعت لڑاتا ہے۔ مگر ایک سیدھا سا مُقدّمہ اُس کے سامنے بیان کرو تو سمجھ نہیں سکتا۔ تدبیر سوچے گا کیا اپنا سر۔ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل ہیں سب نکمّے۔ موجب تضیع وقت۔ اب مدرسہ کے کھیلوں پر نظر کرو۔ تو نِری جسمانی ریاضت۔ اور تفریحِ طبع کے علاوہ دماغی زحمت کا کچھ دخل نہیں۔ کیونکہ اوقاتِ درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف رہے۔ بس دماغی محنت بہتیری ہوئی اب کھیل میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا پڑے۔ تو دماغ کہاں تک

اِس فشار کو وفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے بالکل کام نہ لیا جائے۔ تو
جس طرح گھوڑا تھان پر بندھے بندھے۔ بڑے موتر سے نکال لاتا۔
ادی میں بھر جاتا۔ دانہ گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کرسکتا۔ تھوڑی دور
چلنے سے ہانپنے لگتا۔ کوس دو کوس دوڑانا چاہو۔ تو دَوڑ نہیں سکتا۔
یہی حال آدمی کا ہے۔ کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام نہیں لیتا۔
تو اگر اور کوئی بیماری اُس کو نہ بھی ستائے۔ یہ کیا تھوڑی بیماری ہے۔
کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اِسی آرام طلبی کے نتیجے ہیں۔ کہ ہماری عمروں کے
اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں ؛

خیر کابل کے پٹھانوں اور گوروں کے ساتھ ہم ہندوستانی گرُگیں کیا
مقابلے کریں گے۔ اپنے ہی مُلک کے دیہاتی کبھی شہر میں آنکلتے ہیں۔ تو اُن کو
دیکھکر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ کہ الٰہی! یہ بھی آدمی ہیں! جن کی کاٹھیاں
لوہے کی اور ہاتھ پاؤں پتھر کے ہیں۔ معلوم ہے کہ ساگ بھوجی اور جوار
باجرے کی روٹی کے سِوا اور کچھ میسر نہیں آتا۔ مگر یہ آنکھوں دیکھی
بات ہے۔ کہ ایک دیہاتی سَو سَوا سَو من کی چوبلدی گاڑی ہانکے لیے چلا جا رہا
تھا۔ شہر کی بھیٹر دیکھ کر بیل بِدکے۔ کہ گاڑی کا ایک پہیّہ نالی میں جا تارہا۔
بیلوں نے بہتیرا زور مارا پہیّہ جگہ سے نہ کھِسکا۔ گاڑیبان نے اُتر کر کمر کا
سہارا لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکا دیا کہ بیچ سڑک
میں۔ نہ دیہاتیوں کا پانی۔ نہ شہریوں کا مار اللھم۔ نہ اُن کا چبینا اور نہ
ہمارے بادام پستے۔ بیشک شہر اور دیہات کی آب وہوا میں بھی بہت

بڑا فرق ہے۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور اُن کا ٹانٹھا پن ہے محنت کی وجہ سے۔ شہر کی ایک تو کثرت آبادی کی وجہ سے آب و ہوا خراب۔ اُس پر محنت مشقت ندارد۔ جس کو دیکھو بدن پر بوٹی نہیں۔ اور بوٹی ہو۔ تو کہاں سے ہو۔ بیچارے کو کبھی کھُل کر بھوک نہیں لگتی۔ اور مارے ہوکے کے کچھ بے اشتہا کھا لیتا ہے۔ تو ہضم نہیں ہوتا۔ اور جو ہم میں پہلوان کہلاتے ہیں سینہ اُبھرا ہوا ہے۔ قبضے چڑھے ہیں۔ دیکھنے کو موٹے تازے۔ داؤ پیچ بھی خوب رواں۔ مگر اصلی بل بوتا ان میں بھی نہیں ؛

اس پر ایک حکایت یاد آئی ہے۔ کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا تو سلاطین کو سوائے اوقات گذاری کے اور کوئی کام نہ تھا۔ نکمّے بیٹھے بیٹھے ان کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے۔ کہ ستار بجا رہے ہیں۔ یا بٹیر لڑا رہے ہیں۔ یا شطرنج کھیل رہے ہیں۔ یا اس کی دُھن ہے۔ کہ کوئی ایسی قسم کا کھانا پکوائیے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ ایک صاحبِ عالم کو پہلوانوں کی کُشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہت سے پہلوانوں کے راتب بندھے تھے۔ اور اُنھوں نے ایسی ایسی جوڑیں تیّار کی تھیں۔ کہ رجواڑوں میں جا جا کر کُشتیاں مارتے تھے۔ ایک مصاحب کو یہ سوجھی۔ کہ ان دنوں ولایتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں کسی ولایتی کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے صاحبِ عالم اس ایجاد کو سُن کر پھڑک گئے۔ اور فرمایا وبھئی واللہ تخت کی قسم ہے! کیا بات پیدا کی ہے! معمولی کُشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اُکتا گیا۔ ولایتی کی کُشتی میں مزہ تو خوب آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے۔

داروغہ جی ادینا اِن کو ایک دوشالہ۔ اور بھائی تم ہی اس کشتی کا اہتمام بھی کرنا۔ اور میں حضور میں بھی عرض کروں گا۔ سرفراز فرمائیں گے"۔

نہیں معلوم۔ ظالموں نے کیا تدبیر کی کہ ایک اکھڑ وحشی ولایتی کو کچھ دے کر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو راضی کر لیا۔ ولایتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا سچ تو یہ ہے۔ کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھہرتی تھی آدمی کاہے کو تھا۔ ایک دیو کا دیو تھا۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکتی ہوئیں۔ میلے کثیف کپڑے۔ چار چار پانچ پانچ گز سے مست دُنبے کی سی بو آتی تھی۔ ایسی سخت کہ ناک نہ دی جائے۔ پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ۔ اِدھر جوتیوں سے۔ اُدھر مشکیزہ سے چپڑ چپڑ کی آواز چلی آئے۔ خونخوار آنکھیں۔ ڈراؤنی صورت۔ لوگ جو اِس کو بہلا پُھسلا کر لائے تھے اُس کے گرداگرد ایسے معلوم ہوں جیسے بڑے آدمی کے آگے بچے۔ اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پڑے جھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڑ پیل رہا ہے۔ اور کوئی تین سوا تین من کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اس خوبصورتی اور صفائی سے ہلا رہا ہے۔ کہ سارے تماشائیوں کی ٹکٹکی اس پر بندھی ہے۔ کوئی لیزم کی کثرت کر رہا ہے۔ کوئی بنیٹی کے کرتب دکھا رہا ہے۔ اِتنے میں غل ہوا کہ وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لا کر اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا۔ اُس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں کا رنگ فق ہوا۔ اب کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ کہ موت کے منھ میں جائے۔ اور ولایتی ہے کہ زمین میں آلتی پالتی مارے ہینگ کے مشکیزہ کا گا ڈیہ

بنائے نظر حیرت و تعجب سے سب کو بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اور ان پہلوانوں کو سمجھتا ہے۔ کہ نٹوں کا تماشا کر رہے ہیں ؛

اکھاڑے کا اُستاد اگرچہ تھا تو عمر سے اُترا ہوا۔ مگر اُس کا بدن ایسا مُرتّب تھا۔ اور اُس کو ایسے ایسے داؤ گھات یاد تھے کہ یکایک کوئی اُس سے لڑنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا۔ مگر وہ خوب جانتا تھا ع

فربہی چیزے دگر آماس چیزے دیگر ست

اُس نے چپکے سے صاحبِ عالم کے پاس جا کر عرض کیا کہ "آج تک آپ کے اکھاڑے نے کسی سے نیچا نہیں دیکھا۔ اور اُستاد کی برکت سے ہمارے یہاں کے پٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اسفندیار رہیں ۔ لیکن سرکار راجرس کے چاقو کو قصائی کے بُغدے سے بھڑاتے ہیں۔ ساری عُمر ہم نے سرکار کا نمک کھایا۔ حکم کی تعمیل میں مجالِ عذر نہیں۔ پچھڑیں گے تو نہیں۔ مگر اِس کے ہاڑ تو ملاحظہ کیجیے۔ کہ کلائی دونوں ہاتھوں میں سمانی مشکل ہے۔ سرکار کو جان ہی لینی منظور ہے۔ تو بسم اللہ اِس کا دبوچا ہوا آدمی ہڈکا بھی تو نہیں کھانے کا۔ اونٹ کی پکڑ کو اِس کی پکڑ سے کیا نسبت "۔ صاحبِ عالم سمجھے تو سہی۔ مگر سارے میں غل مچ اُٹھا تھا۔ کِس طرح کُشتی کو ملتوی کر دیتے ! ؛

بارے لوگوں نے وِلایتی سے کہا۔ کہ آغا ! اِن لوگوں میں سے جس کے ساتھ تمھارا جی چاہے کُشتی لڑو۔ آغا "ہم سب کے ساتھ لڑے گا"؛

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا۔ خیر ! ایک کی دار و دو۔ اُستاد

اور شاگرد سارے کا سارا اکھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا۔ جو جو داؤ پیچ یاد تھے۔ سبھی نے تو چلائے۔ آغا ہیں کہ "قطب از جا نہ جنبد"۔ لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں +

اِن لوگوں نے نادانی یہ کی۔ کہ آغا سے گتھ گئے۔ اُس نے موقع پا ایک کو تو اِس بغل میں دابا۔ اور دوسرے کو دوسری بغل میں۔ اُسنے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دبایا تھا۔ مگر اُن میں کا ایک تو آج تک کُوب لیے پھرتا ہے اور دوسرا مُدتوں خون تھوکتا رہا۔ اب مُنا اچّھا تو ہوگیا ہے۔ مگر جاڑے کے دِنوں میں مارے پسلیوں کے درد کے بیچارے سے سانس نہیں لیا جاتا +

خیر ابنی آدم میں یہ ولایتی پٹھان تو اَور ہی نسل کے ہیں۔ اور اُن کی سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہے۔ مگر اس کے عقلی دلائل موجود ہیں۔ کہ اگر ہم اپنے طرزِ تمدن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری رعایت کریں۔ اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں۔ تو آیندہ کی نسلیں بہت بہتر ہوسکتی ہیں۔ یہ سچ ہے۔ کہ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے والے ٹھہرے۔ ہم کو خدا نے محنت کے لئے پیدا نہیں کیا۔ اور نہ ہم سے محنت کا تحمّل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر شاقہ محنت نہ ہو۔ تو جس قدر برداشت کی جاسکتی ہے۔ وہ بھی سو دوا کی ایک دوا ہے۔ اور پھر ہلدی لگے نہ پھٹکری"

(نذیر احمد)

عقل کی نارسائی

(از ابن الوقت)

بلاشبہہ مبدا رفیاض نے انسان کو ظاہری باطنی جتنی قوتیں دی ہیں سب میں عقل بڑی زبردست ہے۔ اور وہی مدار تکلیف شرع بھی ہے لیکن بیش برین نسیت۔ کہ عقل بھی ایک قوت ہے۔ اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں۔ مثلاً آنکھ کہ ایک خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے اُس سے باہر نہیں۔ پھر بے روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسام کثیف میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر دیکھنے والا خود متحرک ہو۔ مثلاً فرض کرو کہ کشتی یا ریل میں ہو۔ تو وہ اُلٹا ٹھہری ہوئی چیزوں کو متحرک دیکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں ٹھہرا ہوا۔ تیز حرکت تشکل معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکے لکٹی سے کھیلتے ہیں۔ پیالے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کر دیں۔ تو لچکی ہوئی دکھائی دے گی شفاف پانی کی تہ کی چیزیں اوپر کو اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اسی طرح اور بہت سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے ÷ غرض جس طرح مثلاً ہماری قوت باصرہ محدود اور ناقص ہے۔ اسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے۔ وہ بھی نقصان سے بری نہیں۔ اور اُس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں غلطی کے لئے تو اختلاف رائے کی دلیل کافی ہے۔ ہندسہ کے علاوہ جس کے اصول بدیہیات پر مبنی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُس میں اختلاف ہو نہیں سکتا ڈاکٹر فلسفی منجم۔ ایسٹرانومرز ÷ (ہیأت داں) پالیٹیشنز (مدبران ملک) اہلِ

÷ ایس ٹر ان مر۔ واحد۔ ز علامت جمع ‖ پالی ٹی شن ین = واحد۔ ز علامت جمع

مذاہب وغیرہ وغیرہ سبھی کو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں منطق کے قاعدے منضبط ہوئے۔ مناظرے کے اصول ٹھہرائے گئے مگر اختلاف نہ کم ہوا اور نہ تاقیامت کم ہو۔ جب ہست و نیست کا اختلاف ہو تو ضرور ایک برسر غلط ہے ؛

اگرچہ عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستنبط ہو سکتا ہے مگر ہم ذرا اِس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہل یورپ کو سیکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں کہ کسی کو کیمیا کا حکمی نسخہ مل گیا ہوتا اور وہ اُس کو عام بھی کر دیتا۔ تو اِتنا فائدہ نہ پہنچتا۔ جِتنا کہ ان ماڈرن ڈسکوریز؛ یعنی زمانۂ حال کی دریافتوں سے ہوا۔ اور جن اقبال مندوں کو خدا نے واقعات اور موجوداتِ نفس الامری میں غور و خوض کرنے کی دُھن لگا دی ہے۔ خدا اُن کی کوششوں کو مشکور و کامیاب کرتا ہے۔ بحرِ بے پایانِ موجودات میں غوطے لگا رہے ہیں۔ اور معلوماتِ جدید کے بے بہا موتی ہیں۔ کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں اِن ماڈرن ڈسکوریز میں سے (زیادہ نہیں) صرف ایک چیز عام فہم کہ جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اُٹھا رہے ہیں ریل ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں۔ کہ دُنیا میں گھر گھر آگ تھی۔ گھر گھر ہنڈیاں پکتی تھیں ہر متنفس بھاپ سے بخوبی واقف تھا۔ سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سٹیم (بھاپ) کی طاقت کیوں نہیں معلوم ہوئی۔ اور یہی سوال ہر ڈسکوری کی بابت ہو سکتا ہے۔ جو اب تک ہوئی یا آیندہ کسی وقت میں ہو ؛

آ ڈسکوری = واحد۔ ز علامت جمع۔

سر آئزک نیوٹن جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا۔ کہتا تھا کہ ”خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بکھرے پڑے ہیں۔ اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے جمع کر رہا ہوں“۔ یہ مقولہ تھا اُس شخص کا جس نے زمین اور آسمان کے قلابے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا۔ اور آج سارا یورپ اُس کے نام پر فخر کرتا ہے۔ جن کو خدا نے عقل دی ہے۔ وہ تو یوں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ایک ہمارے زمانے کے انگریزی خوان ہیں۔ کہ سیدھی سی اُقلیدس کی نئی شکل پوچھو۔ تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ اور لن ترانیاں یہ ”کہ ہمچو ما دیگرے نیست“ پس جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ عقل انسانی کا قصور ہے۔ کہ کُھلتا چلا جاتا ہے۔ اب سے زیادہ نہیں۔ صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی۔ کہ مہینوں کی مسافت ہم گھنٹوں میں طے کر سکیں گے۔ یا ہزارہا کوس کا حال چند لمحے میں معلوم کر لیا کریں گے یا آگ سے برف جمائیں گے یا کپڑے کی کل میں کپاس بھر کر اچھے خاصے دُھلے دُھلائے تہ کیے ہوئے تھان نکال لیا کریں گے۔ اور ابھی کیا معلوم۔ کہ ہم کیا کیا کر سکیں گے۔ مگر پھر بھی رہیں گے۔ آدمی۔ عاجز۔ ناچیز۔ بے حقیقت۔

بھلا آدمی کیا عقل پہ ناز کریگا۔ جب کہ اُس کو پاس کے پاس اتنا تو معلوم ہی نہیں۔ کہ روح کیا چیز ہے اور اُس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا

تعلق ہے۔ وقت کے اَزَلی اَبَدی ہونے پر خیال کرتے ہیں۔ تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طرفۃ العین بلکہ اس سے کم۔ اور اِس ہستی پر انسان کے یہ ارادے اور یہ حوصلے۔ کہ گویا زمین و آسمان میں سمانا نہیں چاہتا۔ پھر کیسے کیسے لوگ ہو گزرے ہیں۔ کہ اِس سرے سے اُس سرے تک ساری زمین کو ہلا مارا۔ اور مر گئے تو کچھ بھی نہیں۔ ایک تودۂ خاک! آخر وہ کیا چیز تھی؟ جو اُن میں سے نکل گئی ؛ حیوانات۔ نباتات۔ لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکّر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین سے پیدا ہوتے اور پھر اُسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے؟ کہ یہ کیا ہو رہا ہے! اور کس غرض سے ہو رہا ہے۔! ؛

(نذیر احمد)

کارخانۂ قدرت

(از ابن الوقت)

کِسی کتاب میں نظر سے گذرا۔ کہ زمانۂ حال کا کوئی فلسفی خُردبین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ سَو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں بمشکل شمار کر سکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اِتنی مخلوقات ہو۔ تو تمام کرۂ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے کتنی مخلوقات ہوگی؛ خُدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرداگرد

۵۰ ہم میل کے دل کا ہوائی کرہ ہے۔ اور اس میں بھی جان داروں کی ایسی ہی یا اِس سے زیادہ اکثرت ہے ؛

ہر چند کارخانۂ قدرت الٰہی کی عظمت و شان فہم بشر سے خارج ہے۔ مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل مُدّتوں تک غور کرتا رہے۔ تو ضرور اُس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور درماندگی اور بے وقعتی کا یقین پیدا ہوگا جس کو میں دین داری کی مبنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں۔ اِس کے بعد ذہن کو اِس طرف متوجہ کرنا چاہیئے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ با ایں عظمت کیسی عمدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ اَجرام فلکی کے اِتنے اِتنے بڑے بے شمار گولے۔ کہ خُدا کی پناہ! اور خود زمین سب چکّر میں ہیں۔ خُدا جانے کب سے ؟ اور کیوں ؟ اور کب تک ؟ اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہوگیا ہے۔ تو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہے۔ کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہوگا۔ اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب میں اگر غلطی نہو۔ تو منٹ اور سکنڈ کیسا! سکنڈ کے ہزارویں حصّے کی قدر بھی آگا پیچھا نہیں ہو سکتا ؛

یہاں روئے زمین پر ایک جھنگے۔ ایک دانے۔ ایک پھل۔ ایک پنکھڑی۔ گھاس کے ایک ڈنٹھل۔ چھوٹی سے چھوٹی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز

کو بھی نظر غور سے دیکھو۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و غایت ہے۔ جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اُس چیز میں موجود ہے۔ مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے۔ تو اُس کے پاؤں کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پولے ہیں۔ کہ ریت میں نہ دھنسیں اُس کی گردن بہت لمبی ہے۔ تاکہ اونچے درختوں کے پتّے چر سکے۔ اُس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے۔ جس میں کئی کئی ہفتوں کے لئے کھانا پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے مُلک میں وہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجّب نہیں۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس کوہان کا گودام ہے۔ کہ اگر اُس کو ایک عرصۂ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان کی چربی بدل ما تحلّل کا کام دے۔ ہرن وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں۔ تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لئے پُھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں۔ ہاتھی کے ایک سونڈ لٹک رہی ہے۔ جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے ؛ پرندوں کے پُھٹّے سُبک ہیں تاکہ ہوا میں اُڑ سکیں ؛ دریائی جانوروں کے پنجے کھال سے جُڑے ہوئے ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپّو ہیں۔ گوشت خوار جانوروں کے پنجے اور دانت اُن کی غذا کے مناسب ہیں۔ نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں۔ خول ہیں۔ سرد مُلک کے جانوروں کی اون بڑی بڑی اور گھنی ہے۔ کہ جاڑا

نہ کھائیں ؛ جتنے جاندار معرضِ تلف میں ہیں۔ اُن میں توالد و تناسل کی کثرت ہے۔ تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک مچھلی لاکھ سے زیادہ انڈے دیتی ہے ؛ آدمی چونکہ ابقاے حیات کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہنچا سکتا ہے۔ سینگ اور پنجے اور اُون۔ اِس قسم کے سامان قدرتی اُس کو نہیں دیے گئے۔ جس مُلک میں نباتات کی کثرت ہے وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ مُلک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے۔ تو اُس کا ایک ایک رُواں صانعِ قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے۔ اُس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پُرزہ ہاتھ ہے۔ کہ دُنیا میں جس قدر انسان کے تصرّفات ہیں (اور انسان کی بساط پر خیال کرو۔ تو اُن تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے) سب اِسی پُرزے کے ہیں۔ اہلِ یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ کلیں بنائی ہیں۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ اِن کلوں سے عقلِ انسانی کی قوت بڑی شدّ و مد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک بکھیڑا ہے۔ کہ بیگھوں زمین پر پھیلا ہے۔ سیکڑوں پُرزے۔ ہزارہا پیچ۔ بیلن پہیے۔ چرخیاں۔ کمانیاں خدا جانے دُنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کیے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے۔ جس کے لئے کل بنائی گئی ہے۔ یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔ اور ایک ادنیٰ سی کل خدا کی

بنائی ہوئی ہے۔یہی آدمی کا ہاتھ۔کہ ہزار ہا قسم کے کام اِس سے نکلتے ہیں۔اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر۔کہ ایک کفِ دست ہے اور تین تین جوڑ کی پانچ اُنگلیاں۔اللہ اللہ خیر صلاح !!

اِنسان کے بدن میں ایک اَور ذرّے بھر کی چیز آنکھ ہے۔اُس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔اُن سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتی ہے۔مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو۔کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاواک ہے۔جس میں نگینہ کی طرح آنکھ تعبیہ کی ہوئی ہے۔اوپر بھوں کا چھجے دار سائبان۔سامنے پپوٹوں کا پردہ۔پردے میں پلکوں کی جھالر۔پھر پپوٹے کے اندر منافذ ہیں۔جن میں سے آئینۂ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رِستی رہتی ہے۔یہ وہی رطوبت ہے۔جو زیادہ ہوکر آنسو بن جاتی ہے۔جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے۔گویا اُتنی ہی دفعہ آئینے پر پُچارا پھرتا ہے۔گرد اور دھوئیں اور کنکر کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔جس کے یہ معنی ہیں کہ پُچارا کافی نہیں بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے ؂

میرا تو کیا منہ ہے۔کہ موجوداتِ عالم میں جو اسرارِ حکمت مضمر ہیں۔اُن کا ایک شمّہ بھی بیان کرسکوں۔مگر میری غرض اِسی قدر ہے۔کہ دُنیا کے کارخانے کو اِس نظر سے دیکھنا چاہیئے۔کل میں نے آیت اللہ کا سبق سُنا۔وہ عجائبِ قُدرت پڑھتا ہے۔کسی شخص نے نیچرل فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اُردو میں ترجمہ کردیے ہیں۔اُسی میں

لکھا تھا۔ کہ "مچھر کے مُنھ کے آگے جو ایک پتلی سونڈ سی ہوتی ہے وہ حقیقت میں ایک تلوا ہے۔ اُس تلوے میں تین اوزار۔ ایک تو سوئی جس کو مچھر مسام میں داخل کرتا ہے۔ ایک آری۔ کہ مسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو۔ تو اُس سے کام لے۔ اور ایک سینگی۔ جس کی راہ خون چوستا ہے"۔ اُس میں اِتنی بات اور بھی تھی۔ کہ "اِس شکل خاص میں مچھر کی مُدّت حیات صرف تین دن کی ہے"۔ ایک مقام پر تھا۔ کہ "تتلی کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار دیو نیاں ہیں"۔ اس طرح کی باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر نہ سُنے جیسی کہ اُس کی عادت ہے تو ہر ہر ذرّہ اس بات کی گواہی دیگا۔ کہ اُس کو کسی بڑے قدرت والے دانشمند۔ ہمہ داں۔ حاضر۔ ناظر۔ سمیع و بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں۔ کہ انسان صمیم قلب سے موجوداتِ عالم میں غور اور خوض کرے۔ اور اُس کا دل اندر سے نہ بولنے لگے۔ کہ یہ اِتنا بڑا کارخانہ ایسی عُمدگی اور انضباط خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ واقعات اِتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اُن میں قاعدہ کا کہاں پتا۔ اور انضباط کا کیا مذکور! اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا؟ کہ دُنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک تو اُس میں رتّی برابر فرق پڑا نہیں ؛

(نذیر احمد)

شمس العلما مولوی شبلی نعمانی

از سفرنامہ

قسطنطنیہ کے مختصر حالات

موجودہ حالت یہ ہے۔ کہ آبنائے باسفورس کی شاخ۔ جو دُور تک چلی گئی ہے۔ یہ شہر اُس کے دو کناروں پر آباد ہے۔ اور اِس وجہ سے اِس کے دو حصے بن گئے ہیں۔ ایک حصہ **استنبول** کہلاتا ہے۔ اور تمام بڑی بڑی مسجدیں۔ کتب خانے۔ سلاطین کے مقبرے۔ اِسی حصہ میں ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی بھی کثرت سے یہیں ہے۔ دوسرا حصہ **پیرہ** سے شروع ہوتا ہے۔ اور اُس کے انتہائی جانب پر **شبکطاس** وغیرہ واقع ہیں۔ جہاں سلطان کا ایوانِ شاہی اور قصرِ عدالت ہے پیرہ کی دوسری طرف غلطہ ہے۔ اور چونکہ تمام بڑے بڑے یورپین سوداگر اور سفرائے سلطنت یہیں سکونت رکھتے ہیں۔ اُس کو یورپین آبادی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کہتے ہیں۔ کہ دُنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کے برابر خوش منظر نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے۔ کہ منظر کے لحاظ سے اُس سے زیادہ خوش نما ہونا خیال میں بھی نہیں آتا۔ اِسی لحاظ سے اُس کی بندرگاہ کو انگریزی میں "گولڈن ہارن" (یعنی سُنہری سینگ) کہتے ہیں۔ کہیں کہیں عین دریا کے کنارے پر عمارتوں کا سلسلہ ہے اور دُور تک چلا گیا ہے۔ عمارتوں کے

آگے جو زمین ہے۔ وہ نہایت ہموار اور صاف ہے۔ اُسکی سطح سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے۔ اور وہاں عجیب خوش نما منظر پیدا ہو گیا ہے ؛

شہر کی وسعت تمدن کا اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ خاص استنبول میں پانسو جامع مسجدیں۔ ایک سو اکھتر حمام۔ تین سو چونتیس سرائیں۔ ایک سو چونسٹھ مدارس قدیم۔ پانسو مدارس جدید۔ بارہ کالج۔ پینتالیس کتب خانے۔ تین سو پانچ خانقاہیں۔ اڑتالیس چھاپے خانے ہیں۔ کاروبار اور کثرت آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے۔ کہ متعدد ٹراموے گاڑیاں بارہ دخانی جہاز۔ زمین کے اندر کی ریل معمولی ریلیں۔ جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد چھوٹتی ہیں۔ ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ اور باوجود اسکے سڑکوں پر پیادہ پا چلنے والوں کا اِس قدر ہجوم رہتا ہے۔ کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے۔ غلطہ اور استنبول کے درمیان میں جو پُل ہے۔ اُس پر سے گذرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہے۔ اُسکی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپے سے کم نہیں ہے ؛

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں۔ میرے تخمینہ میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہونگے بعض بعض نہایت عظیم الشان ہیں۔ جن کی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چائے و قہوہ وغیرہ مہیا رہتا ہے۔ اکثر قہوہ خانے دریا کے ساحل پر اور بعض عین دریا میں ہیں جن کے لئے لکڑی کا پُل بنا ہوا ہے۔ قہوہ خانوں میں روزانہ اخبارات بھی موجود رہتے ہیں۔ لوگ قہوہ پیتے جاتے ہیں۔

اور اخبارات دیکھتے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ بلکہ ان تمام ممالک میں قہوہ خانے ضروریات زندگی میں محسوب ہیں۔ میرے عرب احباب جب مجھ سے سُنتے تھے۔ کہ ہندوستان میں اسکا رواج نہیں۔ تو تعجب سے کہتے تھے "وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں"۔ اِن مُلکوں میں دوستوں کے مِلنے جُلنے اور گرمی صحبت کے موقعے یہی قہوہ خانے ہیں ؂

افسوس ہے۔ کہ ہندوستانیوں کو اِن باتوں کا ذوق نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں۔ کہ اس قِسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لئے کسقدر ضروری ہیں۔ اور طبیعت کی شگفتگی پر اِن کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دوستانہ مجالسیں ہمارے ہاں بھی ہیں جس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ کسی دوست کے مکان پر دو چار احباب کبھی کبھی مِل بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس طریقے میں دو بڑے نقص ہیں۔ اول تو تفریح کے جلسے پُر فضا مقامات میں ہونے چاہئیں۔ کہ تازہ اور لطیف ہوا کی وجہ سے صحّت بدنی کو فائدہ پہنچے۔ دوسرے سخت خرابی یہ ہے۔ چونکہ یہ جلسے پرایوٹ جلسے ہوتے ہیں۔ اِس لئے اُن میں غیبت شکایت اور اِس قسم کی لغویات کے سِوا اور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ بخلاف قہوہ خانوں کے جہاں مجمعِ عام کی وجہ سے اِس قسم کی باتوں کا موقع نہیں مِل سکتا۔ قسطنطنیہ اور مصر میں مَیں ہمیشہ شام کے وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اِس قسم کے تذکرے نہیں سُنے۔ تفریح اور بذلہ سنجی کے سِوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہوسکتا تھا ؂

قسطنطنیہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اگر کسی کو یورپین اور ایشیائی تمدن کی تصویر ایک مُرقع میں دیکھنی ہو۔ تو یہاں دیکھ سکتا ہے۔ کُتب فروشوں کی دُکانوں کی سیر کرو۔ تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دُکان ہے۔ سنگ رُخام کا فرش ہے شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں۔ کتابیں جس قدر ہیں۔ مجلّد۔ اور جلدیں بھی معمولی نہیں۔ بلکہ عموماً مُطلّا و مذہّب۔ مالکِ دُکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ دو تین کم سِن خوش لباس لڑکے اِدھر اُدھر کام میں لگے ہیں۔ تم نے دُکان میں قدم رکھا۔ ایک لڑکے نے کُرسی لاکر سامنے رکھ دی۔ اور کتابوں کی فہرست حوالے کی۔ قیمت فہرست میں مذکور ہے۔ اور اُس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں ؛

دوسری طرف سڑک کے کنارے چبوتروں پر کتابوں کا بے قاعدہ ڈھیر لگا ہے۔ زمین کا فرش اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ تین چار آدمی سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ قیمت چُکانے میں گھنٹوں کا عرصہ درکار ہے ؛

اِسی طرح ہر پیشہ و صنعت کی دُکانیں۔ دونوں نمونے کی موجود ہیں۔ عام صفائی اور زیب و زینت کا بھی یہی حال ہے۔ غلطہ کو دیکھو۔ تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ دُکانیں بلند اور آراستہ۔ سڑکیں وسیع اور ہموار۔ کیچڑ اور نجاست کا کہیں نام نہیں۔ بخلاف اسکے استنبول میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اکثر سڑکیں ناصاف اور بعض بعض جگہ اس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل ؛

اس شہر میں آکر ایک سیاح کے دل میں غالباً جو خیال سب سے پہلے آتا ہوگا۔ وہ یہ ہوگا۔ کہ اِس عظیم الشان دارالسلطنت کے دو حصّوں میں اسقدر اختلافِ حالت کیوں ہے؟ چنانچہ میرے دِل میں سب سے پہلے یہی خیال آیا۔ میں نے اس کے متعلق کچھ بحث و تفتیش کی۔ باشندوں کے اختلافِ حالت کا سبب تو میں نے آسانی سے معلوم کرلیا یعنی مسلمانوں کا اِفلاس اور دوسری قوموں کا تموّل لیکن سڑکوں اور گزرگاہوں کی ناہمواری و غلاظت کا بظاہر یہ سبب قرار نہیں پاسکتا تھا۔ اِس لئے میں نے ایک معزز ترکی افسر یعنے حسین حسیب آفندی پولیس کمشنر سے دریافت کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ "ہماری مینوسپلٹی کے ٹیکس بہت کم ہیں۔ بہت سی چیزیں محصول سے مُعاف ہیں۔ لیکن غلطہ میں یورپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس اداکرتے ہیں۔ اِس لئے مینوسپلٹی اُن رقموں کو فیاضی سے صرف کرسکتی ہے" مجھے خیال ہوا۔ کہ یہ وہی غلطہ ہے۔ جس کی نسبت ابن بطوطہ نے نجاست اور میلے پن کی سخت شکایت کی ہے۔ یا اب اُن کو صفائی و پاکیزگی کا یہ اہتمام ہے۔ کہ اُس کے لئے بڑے بڑے ٹیکس اداکرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے ؎

یہاں کی عمارتیں ہندوستان کی عمارتوں سے بالکل جُدا وضع کی ہیں۔ مکانات عموماً سہ منزلہ چہ منزلہ ہیں صحن مطلق نہیں ہوتا۔ عمارتیں

تمام لکڑی کی ہیں۔ بڑے بڑے اُمرا اور پاشاؤں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ یہاں اکثر آگ لگتی ہے۔ کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا۔ کہ دو چار گھر آگ سے جل کر تباہ نہوں۔ اور کبھی کبھی تو محلّے کے محلّے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لئے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے۔ کئی سو آدمی خاص اس کام پر مقرر ہیں۔ ایک نہایت بلند منارہ بنا ہوا ہے۔ جس پر چند ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دیکھیں۔ فوراً خبر کریں۔ اِس قسم کے اَور بھی چھوٹے چھوٹے منارے جا بجا بنے ہوئے ہیں۔ جس وقت کہیں آگ لگتی ہے۔ فوراً توپیں سر ہوتی ہیں۔ اور شہر کے ہر حصّے سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ اُن کو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا اُنکی جھپٹ میں آکر پس جائے تو کچھ الزام نہیں ہیں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں معلوم ہوا۔ کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے ؎

آب و ہوا یہاں کی نہایت عُمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے۔ گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا۔ اِس قدر خوش گوار ہے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجّب ہے۔ کہ ہمارے یہاں کے اُمرا شملہ اور مینی تال کے بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے! پانی پہاڑ سے آتا ہے۔ اور نہایت ہاضم اور خوش گوار ہے ؎ (شبلی نعمانی)

مصر کی قدیم یادگاریں

آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اِس شہر کی ہمسری نہیں کر سکتا سچ یہ ہے۔ کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے۔ سوادِ شہر کے ویرانوں میں اس وقت تک سیکڑوں خزف ریزے ملتے ہیں۔ جن پر کئی کئی ہزار سال قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں۔ مجھکو اِتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے۔ کہ اِتنی ہمت کہاں تھی۔ کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر کرتا۔ البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور اُنھیں کے حال کے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں +

اہرام۔ یہ وہ قدیم مینار ہیں۔ جن کی نسبت عام روایت ہے کہ طوفانِ نوح سے پہلے موجود تھے۔ اور اس قدر تو قطعی طور سے ثابت ہے۔ کہ یونان کی علمی ترقی سے اِن کی عُمر زیادہ ہے۔ کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اِس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مینار نہایت کثرت سے تھے۔ یعنی دو دن کی مسافت میں پھیلے ہوئے تھے۔ صلاح الدین کے زمانہ میں اکثر ڈھا دیے گئے۔ اِن میں سے جو باقی رہ گئے ہیں۔ اور جن پر خاص طور سے اہرام کا اِطلاق ہوتا ہے۔ صرف تین ہیں۔ جو سب سے بڑا ہے۔ اُس کی لمبائی چار سو اسّی فیٹ یعنی قطب صاحب کی لاٹ سے دُگنی ہے نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع سات سو چھ نسٹھ فیٹ ہے۔ مینار کا مکعّب آٹھ کروڑ نوے لاکھ فیٹ ہے۔ اور وزن ارسٹھ لاکھ چالیس ہزار ٹن۔

اِس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے رہے - جڑ میں تیس تیس فیٹ لمبی اور پانچ پانچ فیٹ چوڑی پتّھر کی چٹانیں ہیں۔ اور چوٹی پر جو چھوٹی سے چھوٹی ہیں آٹھ فیٹ کی ہیں +

اُس کی شکل یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع مُربّع چبوترہ ہے۔ اُس پر ہر طرف سے کسی قدر سطح چھوڑ کر دوسرا چبوترہ ہے - اسی طرح چوٹی تک اوپر تلے چبوترے ہیں اور اِن چبوتروں کے بتدریج چھوٹے ہوتے جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ تعجّب یہ ہے۔ کہ پتّھروں کو اس طرح وصل کیا ہے کہ جوڑ یا درز کا معلوم ہونا تو ایک طرف۔ چونہ یا مصالح کا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے استحکام کا یہ حال ہے - کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال برابر فصل نہیں پیدا ہوا ہے +

اِن میناروں کو دیکھکر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے - کہ جرِّ ثقیل کا فن قدیم زمانہ میں موجود تھا - کیونکہ اِس قدر بڑے بڑے پتّھر اتنی بلندی پر جرِّ ثقیل کے بغیر چڑھائے نہیں جا سکتے - اور اگر اس ایجاد کا زمانۂ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں - تو جرِّ ثقیل سے بھی بڑھکر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑیگا +

اِن میناروں میں سے ایک جو سب سے چھوٹا ہے - کسی قدر خراب ہو گیا ہے - جس کی کیفیت یہ ہے - کہ سنہ ۵۹۳ ہجری میں ملک العزیز (پسر سلطان صلاح الدّین) نے بعض احمقوں کی ترغیب سے اس کو

ڈھانا چاہا۔ چنانچہ دربار کے چند معزز افسر اور بہت سے نقب زن اور سنگتراش اور مزدور اس کام پر مامور ہوئے۔ آٹھ مہینے تک برابر کام جاری رہا اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے برباد کردیے گئے۔ لیکن بجز اس کے کہ اوپر کی استرکاری خراب ہوئی۔ یا کہیں کہیں سے ایک آدھ پتھر اُکھڑ گیا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ مجبور ہو کر ملک العزیز نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔

اَہرام کے قریب ایک بہت بڑا بت ہے۔ جس کو یہاں کے لوگ **ابوالہول** کہتے ہیں۔ اُس کا سارا دھڑ زمین کے اندر ہے۔ گردن اور سر اور دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ چہرہ پر کسی قسم کا سُرخ روغن ملا ہے۔ جس کی آب اس وقت تک قائم ہے۔ ان اعضا کی مناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہ پورا قد ساٹھ ستّر گز سے کم نہ ہوگا۔ باوجود اس غیر معمولی درازی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اس ترتیب اور مناسبت سے بنائے ہیں۔ کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر کا فرق نہیں۔ عبداللطیف بغدادی سے کسی شخص نے پوچھا تھا۔ کہ "آپ نے دنیا میں سب سے عجیب تر کیا چیز دیکھی؟" اُس نے کہا کہ "ابوالہول کے اعضا کا تناسب" کیونکہ عالمِ قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں۔ اُس میں ایسا تناسب قائم رکھنا آدمی کا کام نہیں۔

(شبلی نعمانی)

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی

بزمِ قدرت

دُنیا کی سب محفلیں تغیّرات زمانہ سے درہم و برہم ہو جاتی ہیں مگر خدا کی مرتّب کی ہوئی محفل جس میں انقلابات عالم سے ہر روز ایک نیا لطف پیدا ہوتا رہتا ہے ہمیشہ آباد رہی اور یونہیں قیامت تک جمی رہیگی۔ یہ وہ محفل ہے جس کی رونق کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ پُر غم واقعات اور وہ حسرت بھرے سانحے جن سے ہماری محفلیں درہم و برہم ہو جایا کرتی ہیں۔ اُن سے بزمِ قدرت کی رونق اور دوبالا ہو جاتی ہے ہماری صحبت کا کوئی آشنا حرماں نصیبی میں ہم سے بچھڑ کے مبتلائے دشت غربت ہو جاتا ہے۔ تو برسوں ہماری انجمنیں سُونی پڑی رہتی ہیں۔ ہمارے عشرت کدوں کا کوئی زندہ دل نذر اجل ہو جاتا ہے تو سالہا سال کے لئے وہ ماتم کدے ہو جاتے ہیں مگر جب ذرا نظر کو وسیع کرو۔ اور خاص صدمات کا خیال چھوڑ کے عالم کو عام نظر سے دیکھو۔ تو اُس کی چہل پہل ویسی ہی رہتی ہے۔ بلکہ نئی نسل کے دو چار پُر جوش زندہ دل ایسے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ دُنیا کی دلچسپیاں ایک درجہ اور ترقی کر جاتی ہیں ایک شاعر کا قول ہے ؎

دُنیا کے جو مزے ہیں۔ ہرگز یہ کم نہ ہونگے
چرچے یہی رہینگے۔ افسوس! ہم نہ ہونگے

جس نے کہا ہے بہت خوب کہا ہے۔ بزمِ قدرت ہمیشہ یونہیں دلچسپیوں سے آباد رہیگی۔ ہاں ہم نہ ہونگے۔ اور ہماری جگہ زمانہ ایسے اچھے نعم البدل لا کے بٹھا دیگا

کہ ہماری باتیں محفل والوں کو پھیکی اور بے مزہ معلوم ہونے لگینگی +

الغرض یہ محفل کبھی خالی نہیں رہی۔ کوئی نہ کوئی ضرور رہا۔ جو اس بزم کی رونق کو ترقی دیتا رہا۔ اسی مقام سے یہ نازک مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے کہ زمانہ کی عام رفتار ترقی ہے۔ ایک قوم آگے بڑھتی اور دوسری پیچھے ہٹتی ہے۔ تنزل پذیر قوم کے لوگ اپنے مقام پر جب اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔ زمانہ اور مُلک کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں اور اُن کو دعویٰ ہوتا ہے۔ کہ زمانہ تنزل پر ہے۔ مگر اصل پوچھیئے تو تنزل صرف اُنکی غفلتوں اور راحت طلبیوں کا نتیجہ ہے دُنیا اپنی عام رفتار میں ترقی ہی کی طرف جارہی ہے +

اے وہ لوگو! جو شکایت زمانہ میں زندگی کی قیمتی گھڑیاں فضول گزار رہے ہو ذرا بزم قدرت کو دیکھو تو کس قدر دلکش اور نظر فریب واقع ہوئی ہے۔ تمھارے دل میں وہ مذاق ہی نہیں پیدا۔ کہ ان چیزوں کی قدر کر سکو۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ انسانی جوش کو بڑھاتی ہیں۔ اور طبیعت میں وہ مُفید حوصلے پیدا کرتی ہیں۔ جن سے ہمیشہ نتیجے پیدا ہوئے اور پیدا ہونگے۔ اندھیری رات میں آسمان نے اپنے شب زندہ دار دوستوں کی محفل آراستہ کی ہے۔ تارے کھلے ہوئے ہیں اور اپنی بے ترتیبی اور بے نظمی پر بھی عجب بہار دکھا رہے ہیں۔ دیکھو! ان پیارے خوش نُما تاروں کی صورت پر کیسی زندہ دلی اور کیسی ترو تازگی پائی جاتی ہے؟ پھر یکایک مہتاب کا ایسا حسین اور نورانی مہمان مشرق کی طرف سے نمودار ہوا۔ اور یہ گورے گورے تارے اپنی بے فروغی پر افسوس کر کے غائب ہونے لگے۔ ماہتاب آسمان کے نیلگون طلسی دامن میں کھیلتا ہوا

آگے بڑھا۔ وہ اگرچہ ہماری طرح دل داغدار لے کے آیا تھا۔ لیکن خوش آیا۔ اور ہمارے غربت کدوں کو روشن کر کے بزم قدرت میں نہایت لطیف اور خوش گوار دلچسپیاں پیدا کر کے خوشی خوشی صحن فلک کی سیر کرتا ہوا مغرب کی طرف گیا۔ اور غائب ہو گیا۔ ابھی آسمان کو اُس مہمان کا انتظار تھا جس سے نظام عالم کا سارا کاروبار چل رہا ہے اور جس کی روشنی ہماری زندگیوں کی جان اور ہماری ترقیوں کا ذریعہ ہے۔ آفتاب بڑی آب و تاب سے ظاہر ہوا۔ رات کا خوبصورت اور ہم صحبت چاند اپنے اُترے ہوئے چہرہ کو چھپا کے غائب ہو گیا۔ اور آسمان کا اسٹیج بزمِ قدرت کے دلفریب ایکٹروں سے خالی ہو گیا +

خواب شب کا مزا اُٹھانے والوں کی آنکھیں کھُل کھُل کے اُفق مشرق کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں آسمان کے دَور پر چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اِس کے ساتھ مرغانِ سحر کے نغمہ کی آواز کانوں میں آتی ہے اور آنکھیں مل کے دیکھا ہے۔ تو ہماری نظر کی خیر گی نہ تھی شمع حقیقت تھی جھلملا رہی ہے۔ یک بیک وفورِ طرب نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ گھنٹے بجے چڑیاں چہچہائیں۔ مؤذنوں نے اذانیں دیں اور تمام جانوروں کی مختلف آوازوں نے مل کر ایک ایسا ہمہمہ پیدا کر دیا ہے۔ کہ نیچر کی رفتار میں بھی تیزی پیدا ہو گئی۔ باغ نیچر کے چابکدست کاریگر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے نسیمِ سحر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آئی اور ضابطہ و متین غنچوں کے پہلو گُدگُدانے لگی۔ الغرض قدرت نے اپنی پوری بہار کا نمونہ آشکار ا کر دیا + (عبدالحلیم شرر)

خان بہادر شمس العلما۔ مولوی محمد ذکاء اللہ

وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات

شاید کوئی اور دوسرا مُدبّر و منتظم مُلکی ایسا گزرا ہو کہ جس کی تفضیح اور ہجو اِس مبالغہ سے اور تعریف اِس شدّ و مد سے ہوئی ہو۔ اور اُس کی ساری زندگی کے افعال اور اعمال کی تحقیقات ایسی شہادت تحریری سے ہوئی ہو۔ مگر اُس کی نسبت لکھنے والے طرفدار اور متعصب تھے۔ اگر نظر انصاف سے دیکھئے۔ تو اُس میں یہ بھلائیاں اور بُرائیاں معلوم ہونگی۔ جو ہم نیچے لکھتے ہیں۔ اُس کی فطانت اور فراست و ذہانت کے سب دوست دشمن قائل ہیں۔ کوئی اس میں شُبہ نہیں کرتا کہ وہ بیدار مغز اور ہوشیار دل ایسا تھا۔ کہ امورِ خطیر اور مُعاملات عظیم کے انصرام اور سرانجام کرنے کی اُس میں قابلیت اور لیاقت تھی۔ برسوں تک اُس نے ایک سلطنت بزرگ اور مملکت عظیم کا نظم و نسق کیا۔ سوائے ذہین اور قابل ہونے کے وہ محنت شعار اور جفاکش پرلے درجے کا تھا۔ کاہلی اُس سے کروڑوں کوس دُور رہتی تھی اُس کے جانشین جو ہوئے۔ اُن میں دو چار قابلیت اور لیاقت میں تو ہم پلہ ہوئے۔ مگر محنت و مشقت و کارگزاری میں کہیں اُس سے ہلکے تھے۔ یہی پہلا عالی دماغ تھا جس نے یہ سوچا کہ انگریزی گورنمنٹ سب سے علٰحدہ رہ کر قائم نہیں رہ سکتی۔ اُس کے لئے ضرور ہے۔

کہ وہ اور ہندوستانی رئیسوں سے آمیزش اور سازش کرے۔ یہی باب فتح و نصرت کی کُنجی ہے۔ یہی وہ روشن عقل تھا۔ کہ اُس شاہراہ پر انگریزی گورنمنٹ کو رستہ دکھایا۔ جس پر چلنے سے وہ اپنی منزل مقصود پر پہُنچ گئی گو یہ خیالات اُس وقت انگلستان میں عام پسند نہ تھے مگر بُری بھلی طرح سے تجربہ ہو کر آخر کار وہی صحیح ثابت ہو گئے +

اُس نے انگریزی صوبوں کے حُسنِ انتظام میں اپنی عقل و ذہن کو بہت خرچ کیا۔ اِنقلابوں کے طوفان نے سارے ملک میں اندھیر مچا رکھا تھا۔ کسی سلطنت کا چراغ روشن نہ رکھا تھا۔ شمع افسردہ کی طرح سب میں دھواں نکل رہا تھا۔ مالی اور دیوانی عدالتوں کا بہت بڑا حال تھا۔ وہ نام کی عدالتیں تھیں۔ حقیقت میں اُن کے طفیل وہ ظلم و ستم ہوتے تھے کہ قلم لکھ نہیں سکتا۔ اگر زمیندار تھا۔ تو اُسے مالگزاری کے لئے سر اُس کا شکنجہ بنایا جاتا تھا۔ اگر ساہوکار تھا۔ تو وہ شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ غرض سارے زمانہ کی عافیت تنگ تھی۔ اُس نے اِن سب عدالتوں کی اصلاح کی۔ گو اِن کو اُس نے درجۂ کمال پر نہیں پہُنچایا۔ اور نہ اُن کو اچھا بنایا۔ مگر وہ ایک بُنیاد اُن کی ایسی ڈال گیا۔ کہ پھر اُس پر اَوروں کو ردّے لگا کر عمارت بنانی آسان ہو گئی۔ کوئی حکومت کا کارخانہ ایسا نہ تھا۔ کہ جس کی طرف اُس نے توجہ نہ کی ہو۔ اور اُن میں بہت سی باتوں کا موجد نہ ہو +

اُس نے اپنی سرکار کی ہوا خواہی اور خیر اندیشی میں بھی کوئی دقیقہ

فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر اس میں اُس نے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا۔ جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا۔ تو اُس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا آگا پیچھا نہیں سوچا۔ ازراہِ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا۔ اہلِ انگلستان نے اُس کو بے سروسامانی سمجھا۔ اُس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا۔ کہ وہ عدالت اور صداقت کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا اور مروّت و فتوت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا۔ "اگر ضرورت بود روا باشد"، پر عمل تھا۔ وہ خودرائی کے سبب بر خود غلط اتنا تھا۔ کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا۔ ہر کام اُس کا ایک راز سربستہ اور سرپوشیدہ تھا۔ کسی کام کی اصل و حقیقت کھُلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ گو اُس کے ظاہر ہوجانے سے نقصان نہو۔ وجہ اس کی یہ تھی۔ کہ وہ ہر کام کو بڑے پیچ پاچ سے کرتا تھا۔ غرض اُس میں جو خوبیاں تھیں۔ وہ تحسین کے قابل تھیں۔ اور جو بُرائیاں تھیں۔ وہ نفرین کے لائق یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ رعایا پروری۔ سپاہ کی دلداری۔ لوگوں کو اپنا کرلینا۔ رفاہیت عباد اور معموریِ بلاد کا خیال یہ سب خوبیاں اُس میں ایسی تھیں کہ وہ ایک طوطیٔ خوش رنگ کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اپنی سرکار کی نمک شناسی کے سبب سے اُس کی گنجینۂ آبائی۔ دولت افزائی ایسی ایک بلّی اُس میں تھی۔ کہ وہ اس طوطیٔ خوش رنگ کو نوچے کھاتی تھی۔ مگر اس بلّی کے بھنبوڑنے کے لئے اُس کے پاس ایک کتّا بھی موجود تھا۔ جو اُس کی خود پرستی و خودرائی تھی۔

غرض یہ فضائل اور رذائل اُس میں کام کر رہے تھے۔ جو ایک بڑے بند مکان میں طوطی اور بلّی اور کُتّا کام کریں۔ ہیسٹنگز صاحب کی سب سے زیادہ تعریف اس بات میں تھی۔ کہ اُس نے سارے کارخانوں اور کاموں کے لیے خود ہی مُقدّمات کو ترتیب دیا اور اُس بات کو سرانجام کیا۔ جب وہ ولایت سے ہندوستان میں آیا۔ تو طفل مکتب تھا۔ نوکری ملی تو تجارت کے کارخانے میں۔ کبھی اُس کو اہلِ علم اور منتظمان مُلکی کی صحبت بھی مُیسّر نہ ہوئی۔ جتنے اُس کے یہاں جلیس و انیس تھے۔ اُن میں کوئی اِس سے زیادہ صاحب لیاقت نہ تھا۔ کہ اُس کی لیاقت کو بڑھاتا۔ بلکہ خود اُس کو اُستاد بن کر اور سب کو لیاقت کا سبق پڑھانا پڑا۔ وہ سب کا رہنما تھا۔ اور اُس کا رہنما فقط اُس کی عقل و دانش کا نور تھا ؎

(محمد ذکاء اللہ)

ادب

ادب کے معنی اُس ریاضت محمودہ اور کوشش و سعی کے ہیں۔ جس سے کسب و فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں ؎

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا۔ کہ بے ادب اُسے دیکھکر با ادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے۔ وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے۔ جیسے آہوئے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے۔ وہ اَور

آہوؤں کو پکڑ لاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بُنیاد ادب پر رکھتا ہے۔
اُس کا فکر اُستاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے ؎
تو لالہ و گُل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر۔ کہ سب کو مطبوع ہو۔ نہ یہ کہ ایسے
قہقہے لگائے۔ کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح
کہتے ہیں۔ وہ خردمندوں کے نزدیک نبرد و سلاح ہے۔ اگر تمھاری
ڈاڑھی کوّوں کے پَروں کی سی سیاہ ہو۔ تو بُڈّھوں کی بگلا سی سفید
ڈاڑھی کی ہنسی نہ اُڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گلعذار ہو۔ تو زنگی کے
سامنے آئینہ رکھکر اُسے نہ چِڑاؤ۔ کیونکہ کوئی بدصورت دُنیا میں
بے مصلحت نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سُرخ و سفید تھا۔ ایک
زنگی پر ہنسا۔ تو زنگی نے جواب دیا۔ کہ میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے
لئے زیب ہے۔ اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے۔ تجھے
چاہیئے کہ جو تیرا عیب بیں ہو۔ تو اُس کا ہُنر دیکھ۔ جو تجھے زہر دے۔
تو اُس کو نبات دے۔ جو تجھے مارے۔ تو اُسے آبِ حیات پلا۔ تاکہ تیری عقل
سلامت پسند ہو۔ اور تیرے نام کا خطبۂ اخلاق میں باوازِ بلند پڑھا جائے۔
خُدا سے توفیق ادب کی دعا مانگ۔ کیونکہ ادب کے بغیر لُطفِ رب سے
آدمی محروم رہتا ہے۔ بے ادب اپنے ہی لئے بُرا نہیں ہوتا۔ بلکہ اوروں
کے لئے بھی بُرا نمونہ بنتا ہے۔ ادب انسان کو معصوم بناتا ہے۔ گُستاخی
اور بے باکی غموں کا ہجوم رکھتی ہے ؎

(محمد ذکاء اللہ)

حیا

حیا بھی طرح طرح کی ہوتی ہے۔ اور بیحیائی بھی قسم قسم کی۔ سب سے زیادہ سخت بے حیائی اپنی محبّت میں اندھا ہونا ہے۔ جس میں اکثر انسان مبتلا ہیں۔ ایک شخص جو سرشت انسانی سے بڑا ماہر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے۔ کہ "آدمی اپنے سے سب کے بعد محبّت کرے"۔ مگر دُنیا میں بہت سے آدمی ایسے دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ وہ سب سے پہلے اپنے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں اُن صفات کا یقین کرتے ہیں جو درحقیقت اُن میں نہیں ہوتیں۔ اور اپنی ذات کی قدر و منزلت و قیمت میں مبالغہ کرتے ہیں۔ یہی سخت عیب ہے۔ جس سے انسان جو اپنے سے آپ دھوکا کھاتا ہے اور ذلت اُٹھاتا ہے خلق کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے۔ جب آدمی خودستائی کرتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے۔ جس سے معلوم ہو۔ کہ وہ کوئی بڑی قابلیّت و قدر و منزلت کا آدمی ہے۔ تو ضرور اُس کی ہنسی ہوتی ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ جب کوئی دوسرا شخص ہماری تعریف کرے۔ تو اُس کو حیا و شرم کے ساتھ قبول کریں۔ ظاہر اور باطن دونوں میں فروتنی اور عجز و انکسار اختیار کرنا چاہیئے۔ جب آدمی اپنی نیک صفات کو۔ جو حقیقت میں اُس کے اندر ہیں۔ نمود کے ساتھ دکھائے گا۔ تو شیخی کرکری ہو جائیگی ۞

غرور کرنا بڑی بے حیائی ہے۔ مغرور بڑا بے حیا ہوتا ہے۔ مغرور اپنی

نخوت کے زور سے مصیبتوں کا مقابلہ عبث کرتا ہے۔ وہ اپنے دُگنے زور سے اپنے سرکش دل کے ٹکڑے کرتا ہے۔ نرم پودا ہوا کے جھوکوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ اور اُس کے تمام زور کو اپنے سے دُور کر دیتا ہے اور خود قائم رہتا ہے۔ ایسے ہی فروتن متواضع مُنکسر اپنے عجز و انکسار سے بلاؤں کو سر پر سے ٹال دیتا ہے ؎

سفلے۔ کم ظرف ناشائستہ اپنی اصلی لیاقتوں کی شیخیاں بگھارتے ہیں۔ سچے مہذب اور شائستہ اپنے عجز و ناتوانی کو ظاہر کیا کرتے ہیں۔ علم میں جو لوگ تھوڑی سی لیاقت رکھتے ہیں۔ وہی اپنے عالم ہونے کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں جو عالم علم دستگاہ اور حقیقت آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آگے بہ نسبت پیچھے کے زیادہ دیکھتے ہیں وہ اپنے میں نہیں دیکھتے ہیں۔ کہ ہم کیا جانتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ کیا نہیں جانتے۔ جتنا اُن کا علم بڑھتا ہے۔ اُتنا ہی اپنی جہالت کے علم سے اُن کی حیا زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سمندر کے تیراک ہوتے ہیں۔ ایک عمق کے بعد دوسرا عمق اُن کے آگے ہوتا ہے۔ اُس کی تھاہ کبھی اُن کو نہیں ملتی۔ یہ کم علم ندی نالوں کے تیراک ہوتے ہیں۔ کہ جلدی سے تھاہ کو پا کے خوش ہو جاتے ہیں اور اُس پر گھمنڈ اور فخر کرتے ہیں۔ عالموں کی نظروں کے روبرو۔ پہاڑ پر پہاڑ اور ایک ہمالہ پر دوسرا ہمالہ آتا جاتا ہے۔ جس سے اُن کا منظر فراخ ہوتا جاتا ہے جتنا یہ منظر وسیع ہوتا ہے اُتنی ہی اُن کو حیا اپنی کوتاہ نظری کی بڑھتی جاتی ہے ؎

(محمد ذکاء اللہ)

محنت

ہر بشر کے پیچھے سب حالتوں میں محنت کرنے کا فرض لگا ہوا ہے۔ خواہ وہ کسی جماعت کا ہو۔ جو شریف شرافت نسبی اور شرافت حقیقی تعلیم و تہذیب کے سبب سے رکھتا ہے۔ وہ اپنے دل سے اس امر کو اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے۔ کہ بہبود عوام اور فائدۂ انام میں سعی کر کے محنت میں اپنا حصّہ لوں۔ اس کو ہرگز یہ گوارائے خاطر نہیں ہوتا کہ میں اَوروں کی محنت سے کھاؤں پیوں۔ میں فراغت سے رہوں اور اس کا معاوضہ خود محنت کر کے اپنی سوسائٹی کو نہ دوں۔ عالی خیال نیک کردار اس تصوّر سے بھاگتا ہے۔ کہ یونہیں مبیٹھا رہے اور دعوتیں اُڑایا کرے۔ اور اُس کا معاوضہ کچھ نہ دے۔ نکمّا پن اور سُستی نہ کوئی عزت ہے۔ نہ کوئی منفعت ہے۔ اِس سے فرومایہ اور کمینہ طبائع راضی ہو جاویں۔ مگر عالی ہمّت تو ایسی حالت کو مذلت سمجھتے ہیں۔ اور حقیقی عزّت اور عظمت سے اُسے بعید جانتے ہیں ؛

ایک دانشمند بلند خرد جو خود جدّ و جہد میں مجتہد تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو جو مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ یہ پندسود مند ارقام فرماتا ہے۔ کہ اے میرے پیارے بیٹے! تیرے دل پر اس بات کا نقش شدّت سے زور دیکر نہیں جما سکتا۔ کہ ہر امیر۔ شریف۔ غریب۔ فقیر کی شرطِ زندگی محنت ہے۔ غریب کسان روٹی اپنی پیشانی کی عرق ریزی سے کماتا ہے۔ اور امیر اپنے

شکار کی جستجو میں سعی کر کے اپنی سُستی کو کھوتا ہے۔ جیسے گیہوں کے کھیت میں بغیر ہل چلائے کاشتکار کو کچھ پیداوار ہاتھ نہیں لگتا۔ ایسے ہی مزرعۂ دل میں تخمِ علم بغیر محنت کے بار آور نہیں ہوتا۔ مگر ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ ایسے اتفاقات اور واقعات پیش آسکتے ہیں۔ کہ ایک کسان کھیت بوئے اور وہ اُسکی پیداوار سے محروم رہے اور کوئی دوسرا آدمی اُس سے متمتع ہو۔ مگر علم میں یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ آتش زدگی یا وقوعِ حادثات سے کوئی شخص اپنے مطالعۂ علمی کی ریاضت کے ثمر سے محروم ہوجائے اور یہ ثمر دوسرے کو مِل جائے۔ اُس کے تحصیلِ علم کی تکمیل اور توسیعِ خاص اُسی کی ذاتی منفعت کے لئے ہے۔ اِسی واسطے میرے پیارے بچے! محنت کر اور وقت کو اچھی طرح کام میں لا۔ لڑکپن میں ہمارے قد ہلکے ہوتے ہیں اور دِل مُلائم۔ اُس میں علم خوب جڑ پکڑ سکتا ہے۔ آدمی کی بھی عُمریں مثل فصلوں کے ہوتی ہیں۔ کہ اگر ایک فصل کی کاشت میں غفلت کیجئے۔ تو دوسری فصل میں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ پس اگر ہم اپنی طفلی اور جوانی جو خریف و ربیع کی فصلیں ہیں۔ ضائع کر دینگے۔ تو بُڑھاپا ہمارا۔ کہ کھرسا کا موسم ہے۔ نہایت خوار اور ذلیل ہوگا"۔

(محمد ذکاء اللہ)

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

محمد حسین نام۔ آزاد تخلص۔ دہلوی۔ فن شعر میں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد۔ علوم عربیہ فارسیہ میں حظ وافی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ اُردو میں ان کی نثر پایہ عالی رکھتی ہے۔ تشبیہ و تمثیل کا استعمال نہایت خوبی و لطافت سے کرتے ہیں ؛

اُردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہار مطالب کا وسیلہ ہی کہیں۔ تو گویا وہ ایک اوزار ہے۔ کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچّے نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں۔ وہی اس سے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اُس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے۔ کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعۂ فولادی تیّار کردے۔ جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے۔ اور چاہے۔ تو ایک بات میں اُسے خاک میں ملادے۔ جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے۔ جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیّار کردیتا ہے۔ اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے۔ ان سے حاصل کرلیتا ہے۔ وہ ایک نادر مُرصع کار ہے۔ کہ جسکی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نولکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زرو جواہر اُس کے قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیار ہے۔ جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے

تفل کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یا مصوّر ہے۔ کہ نظر کے میدان میں مُرقّع کھینچتا ہے۔ یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اُسے پھول گُل۔ طوطی وُبلبُل سے سجا کر تیّار کر دیتا ہے] ؛

اِس نادر دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح موقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن اِسکے اِستعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوش نما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال چُھچھا کر دیتا ہے۔ بغیر اِس کے کہ بوند پانی اُس میں ڈالے۔ ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے۔ کہ کبھی نارنجی۔ کبھی گُلناری۔ کبھی آتشی۔ کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے۔ کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ ایسی طرح بوقلمون اور رنگا رنگ اور پھر سرتا پا عالم نیرنگ ؛

جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں۔ اِس میں بڑے بڑے نازک قلم مصوّر گزر گئے ہیں۔ جن کے مرقعے آج تک آنکھوں اور کانوں کے رستے سے ہمارے تمھارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل گویا اُن کے قلم گِھس گئے ہیں۔ اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہو گئی ہیں۔ جس سے تمھاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مرقّع تیّار کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اور تعلیم یافتہ قومیں اسے سُن کر کہتی ہیں۔ کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قُدرت نہیں رکھتی ؛

میرے دوستو! یہ قول اُن کا حقیقت میں بیجا نہیں ہے۔ ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزّت پاتی ہے۔ تو دو سبب سے پاتی ہے۔ اوّل

یہ کہ اُس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں۔ دوم اُس کی انشا پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونوں صفتیں ہیں مگر ناتمام ہیں۔ اور اُس کے سبب ظاہر ہیں ٭

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مُفلس ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے۔ کہ تُم جانتے ہو کُل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اُس کی ولادت کو ہوئے۔ اِس کا نام اُردو خود کہتا ہے۔ کہ میں علمی نہیں بازار کی زبان ہوں۔ اُٹھنے بیٹھنے لین دین کی باتوں کے لئے کام میں آتی ہوں۔ سلاطینِ چغتائیہ کے وقت تک اِس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا مگر خُدا کی قدرت دیکھو۔ کہ ایک بچّہ شاہجہان کے گھر میں پیدا ہو اور انگریزی اِقبال کے ساتھ ستارہ چمکے۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے۔ تو اُنھوں نے مُلکی زبان سمجھ کر اِس کے سیکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر سوا چند دیوانوں کے اُس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی۔ اُن کی فرمائش سے کئی کتابیں کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں۔ تصنیف ہوئیں اور اُن ہی کے ڈھب کی صرف و نحو بھی درست ہوئی۔ ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۳۶ء میں ایک اُردو اخبار جاری ہوا۔ ۱۸۴۲ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اِسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں اور اُردو نے برائے نام زبان کا تمغہ اور سکّہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہیئے۔ کہ جس زبان کی تصنیفی عمر کُل ستّر بہتّر برس کی ہو۔ اُس کی بساط کیا۔ اور اُس کے

الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا۔ پس اس وقت ہمیں اُسکی کمی الفاظ سے دل شکستہ ہونا نہ چاہیئے ؂

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مُفلس یا صاحبِ سرمایہ کہنا بیجا ہے۔ ہر زبان اہلِ زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے۔ اور کسی مُلک والے کا یہ کہنا۔ کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی مُلک کے الفاظ بولیں۔ بالکل بیجا ہے ؂

عربی بھی ایک علمی زبان تھی۔ مگر دیکھ لو۔ اُس میں سارے لفظ تو عربی نہیں۔ صدہا رومی۔ صدہا یونانی۔ صدہا فارسی کے لفظ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور زبان فارسی کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے۔ مگر اس میں بھی غیر زبان کے لفظوں کا طوفان آرہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے۔ کہ پہلے اہلِ مُلک میں علم آتا ہے۔ پھر علمی اشیا کے لئے الفاظ یا تو اُس علم کے ساتھ آتے ہیں یا وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں ؂

علمی الفاظ کا ذخیرہ خُدا نے بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی صاحبِ علم پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا۔ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں ویسے ہی اُن کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اوّل خاص و عام میں علم پھیلتا ہے۔ ساتھ ہی اِس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں مثلاً ریل کا انجن اور اُس کے کارخانے کے صدہا الفاظ ہیں۔ کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے ہوئے۔ تو اَدنیٰ اَدنیٰ

ناخواندے سب جان گئے۔ اگر بے اُس کے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈتے یا پہلے یاد کراتے۔ تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اسی طرح مثلاً میجک لینٹرن اِس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اُس کا یہی نام لیں۔ خواہ فانوس جادو کہیں۔ خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں۔ ہرگز کوئی نہیں سمجھے گا۔ لیکن اگر مشاہدے میں عام ہوجائے اور گھر گھر میں جاری ہوجائے۔ تو اُلٹے سے اُلٹا اس کا نام رکھ دیں۔ وہی بچّے بچّے کی زبان پر مشہور ہوجائے گا اور وہی سب سمجھیں گے ؎

انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں مثلاً ٹیلیگراف یا ایلکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ اُن میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں۔ کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے۔ مگر چونکہ مُلک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں اس لیئے الفاظ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں۔ کہ سب بے تکلّف سمجھتے ہیں۔ پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے۔ تو اِس سبب سے ہے۔ کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی اب اِس کی تدبیر ہوسکتی ہے۔ تو اہلِ مُلک ہی سے ہوسکتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خود علوم و فنون حاصل کرو۔ اپنے مُلک میں پھیلاؤ اور بھائی بندوں کو اُس سے آگاہ کرو۔ جب اُس میں سب قسم کے کاروبار رہینگے۔ تو اُن کے الفاظ بھی ہونگے۔ مُلک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مِٹ جائیگا ؎

(محمد حسین آزاد)

تذکرۂ ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق

جب وہ صاحبِ کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس سے پھولوں کا تاج سجایا جنکی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقاے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا۔ تو آبِ حیات اُس پر شبنم ہوکر برسا۔ کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اُس کے نام سے موزوں ہوا اور اُس کے طغراے شاہی میں یہ نقش ہوا۔ کہ اس پر نظمِ اُردو کا خاتمہ کیا گیا" چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادرالکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اِس کا یہ ہے۔ کہ جس باغ کا بلبل تھا۔ وہ باغ برباد ہوگیا۔ نہ ہم صفیر رہے۔ نہ ہم داستان رہے۔ نہ اِس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اُس زبان کے لئے ٹکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہوگئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادوکار طبیعتیں کہاں سے آئیں؟ جو بات بات میں دِل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغبالی نے اِس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں۔ وہ اَور اور اصل کی شاخیں ہیں۔ اُنھوں نے اَور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اَور رہی

ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اِس زبان کی ترقی کا کیا بھروسا ؎

کیسا مبارک زمانہ ہوگا۔ جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہونگے۔ تحصیلِ علمی اُن کی عمروں کی طرح حالت طفلی میں ہوگی۔ صرف ونحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہونگے۔ اُن نیک نیّت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عُمروں کے ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا۔ کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ اُن کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھینگے۔ مگر کیا کروں۔ جی یہی چاہتا ہے۔ کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو۔ کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اُس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں! کہ نکال ڈالو۔ یہ کام کا نہیں۔ اور کون سی حرکت اُسکی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اِسی واسطے میں لکھونگا۔ اور جو بات اُن کے سلسلۂ حالات میں مُسلسل ہو سکے گی۔ اُس کا ایک حرف نہ چھوڑونگا ؎

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صُحبت نے اُنھیں حالات زمانہ سے ایسا باخبر کر دیا تھا۔ کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تواریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلّی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لُطف علیخاں نے

اُنھیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کہ سنہ ۱۲۰۴ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت کسے خبر ہوگی۔ کہ اس رمضان سے وہ چاند نکلیگا۔ جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے۔ تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلے کے اکثر لڑکے اُنھیں کے پاس پڑھتے تھے۔ انھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے شوقؔ تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں۔ ویسے شعر کہتے تھے محلے کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہوا لے جایا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اِن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا ؞

شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سُنتے سُنتے مجھے بہت شعر یاد ہوگئے۔ نظم کے پڑھنے اور سُننے میں دل کو ایک روحانی لذّت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دُعائیں مانگتا تھا۔ کہ "الٰہی! مجھے شعر کہنا آجائے" ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حُسن اتفاق تھا۔ کہ ایک حمد میں تھا ایک نعت میں۔ مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا۔ کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو اور دوسرا نعت میں۔ جب یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ اس قدرتی اتفاق

کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں۔ کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائی سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سُناتا تھا اور خوشی کے مارے پھُولوں نہ سماتا تھا۔ غرضکہ اسی عالم میں کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے ؛

اِسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک اِن کے ہم سن ہم سبق تھے بیقرار تخلّص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی برّاقی کا یہ عالم تھا۔ کہ کبھی برق تھے اور کبھی بادِ باراں۔ انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں اچھے اچھے موقعے ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحادِ طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے۔ اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے ؛

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سُنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا "یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں"۔ اُنھوں نے کہا۔ ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھیں سے یہ اصلاح لی ہے"۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا۔ اور اُن کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے ؛

سلسلۂ اصلاح جاری تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں لوگوں کی واہ واہ طبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک

جو تلامیذ الرحمن کے آئینوں کا جوہر ہے۔ اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا بعض موقع پر ایسا ہوا۔ کہ شاہ صاحب نے اِن کی غزل کو دیکھ کر بے اِصلاح پھیر دیا اور کہا "کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو" کبھی کہدیا "یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو" بعض غزلوں کو جو اِصلاح دی۔ اُس سے بے ادائی پائی گئی۔ اِدھر اُنھیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی۔ کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھریں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے۔ جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلفُ الرشید تھے۔ اُن کی غزلوں میں توارد سے۔ یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لئے اِنھیں زیادہ رنج ہوا ؎

اگرچہ ان کی طبیعت حاضر۔ فکر رسا۔ بندش چست۔ اُس پر کلام میں زور سب کچھ تھا۔ مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا۔ نہ کوئی اِن کا دست ہمدرد تھا۔ اِس لئے رنج اور دل تنگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل و قال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی "دوشِ نقشِ پا۔ آغوشِ نقشِ پا"۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے خفا ہو کر غزل پھینکدی۔ کہ اُستاد کی غزل پر غزل کہتا ہے! اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ اِن دِنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے

نکالا۔ مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ اُس دن سے جُرأت زیادہ ہوئی۔ اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سُننے والوں کے دلوں میں اثر برقی کی طرح دوڑنے لگی۔ اُس زمانے کے لوگ مُنصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے۔ مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کر کے دِل بڑھاتے۔ بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سُنتے ؛

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ اُنھیں تو شعر سے کُچھ رغبت نہ تھی۔ مگر مرزا ابوظفر ولیعہد۔ کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ شعر کے عاشقِ شیدا تھے اور ظفر تخلص سے مُلک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اِس لئے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہیں آ کر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سُناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے۔ اکثر اِن صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا۔ کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ لیکن اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے ؛

شاہ نصیر مرحوم۔ کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین اُن کی غزل بنانے لگے۔ اُنھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرنے کو چلے۔ اُنھیں ایک میرمنشی کی ضرورت ہوئی۔ کہ قابلیّت وعلمیّت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اُس عہدے پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شقّہ چاہا۔ مرزا مُغل بیگ اُن دنوں میں مختارِکُل تھے۔ اور وہ ہمیشہ اِس تاک میں رہتے تھے۔ کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہو اُس کو سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اِس قُدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقۂ سفارش آسان حاصل ہوگیا۔ اور وہ چلے گئے ٭

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے۔ تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ اِنھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ "میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔" اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی۔ کہ ذرا اِسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سُنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے۔ اور کہا۔ کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ مہینہ بھی ہوگیا ٭

چند سال کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ لکھکر اکبر شاہ کے دربار

میں سنایا۔ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع بدائع صرف کئے تھے۔ مطلع اُس کا یہ ہے !۔

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی ÷

اواخر ایّام میں ایک بار بادشاہ (بہادر شاہ) بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور اُنھوں نے ایک قصیدہ غرّا کہکر نذر گزرانا۔ تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر، اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گزرانا جس کا مطلع یہ ہے !۔

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ ہجری جمعرات کا دن تھا۔ ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا:۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(محمد حسین آزاد)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ عُرف۔ چندے اسد پھر غالب تخلص کیا۔ سرکار شاہی سے نجم الدولہ دبیر الملک خطاب تھا۔ سرکار انگریزی سے پنشن پاتے تھے۔ اکبر آباد مولد۔ دہلی مسکن۔ ۱۸۶۹ء میں بعمر ۷۳ سال راہیِ مُلک بقا ہوئے۔ ان کا کلام زیادہ تر فارسی ہے اُردو میں ایک مختصر دیوان اور ایک مجموعۂ رقعات ہے۔ اُس زمانہ میں مقفّیٰ نویسی کی وبا عام ہو رہی تھی۔ مرزا نے بھی اس کی رعایت کی۔ مگر محاورہ کو اندھا کانا نہیں بننے دیا۔ اِس کے علاوہ لمبے چوڑے القاب آداب اور تکلفات لایعنی سے انشائے اُردو کو پاک کیا۔ وہ اپنے رقعات کی نسبت خود فرماتے ہیں "میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"۔

خط ۱

برخوردار! تمھارا خط پہنچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سروپا وہاں پہنچا امیر بن گیا۔ اُس باغ کی یہ فصل خزاں ہے۔ میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں۔ کہ اُردو کا دیوان غاصب ناانصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نورچشم منشی شیو نراین کو بھیج دیا۔ یقین کُلی ہے۔ کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہوگے۔ ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔ طریقۂ سعادت مندی یہ ہے۔ کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جانکر جہاں جاؤ وہاں سے خط لکھتے رہو اور اپنے مسکن کا پتا ظاہر کرتے رہو۔ ہم تم سے راضی ہیں اور چونکہ تمھاری خدمت اچھی طرح نہیں کی۔

شرمندہ بھی ہیں۔

راقم اسد اللہ خاں

مرقومۂ شنبہ روز عید مطابق ۳۰۔ جون ۱۸۶۶ء

خط ۲

اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے! کیا بُری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی۔ کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دوہفتہ کی سی اور کپڑے میلے۔ پائچے لیرلیر۔ جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستان ایک معشوق خوبرو ہے۔ بدلباس ہے۔ بہرحال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دیدیں اور معلم کو حکم دیا۔ کہ اسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہوگیا۔

مرقومۂ صبح سہ شنبہ ۹۔ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء

(غالب)

خط ۳

او میاں سیدزادۂ آزادہ! دلّی کے عاشقِ دلدادہ! اُردو بازار کے رہنے والے! حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے! نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب۔ وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی نہ سخندانی۔ کس برتے پر

تلپانی - ہائے دلّی ، وائے دلّی ! بھاڑ میں جائے دلّی ! سنو صاحب ! پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سردار خاں ولد دلاور خاں اور نانا اُس احمد حسین خاں کے غلام حسین خان ولد مصاحب خاں ۔ اس شخص کا حال ازروے تحقیق مشرح اور مفصل لکھو ۔ قوم کیا ہے ! معاش کیا ہے ؟ طریق کیا ہے ؟ عمر کیا ہے ؟ لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے ؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے ؟ بھائی ! لکھ اور جلد لکھ ۔

(غالب)

خط ۴

بھائی ! تم کیا فرماتے ہو ؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو ۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا ۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا ۔ کہ نہ لٹتا ؟ ہاں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کرلیا کرتے تھے ۔ سو اُن دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی ۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا ۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں ؟ ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں ۔ کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے ۔ اور وہ نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے ۔ اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکۂ معظمہ انگلستان کی ستایش میں

اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اس کے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر جناب منشی امیر علی خاں صاحب میرے کلام کے مشتاق ہیں تو نسخۂ موسومہ بہ دستنبو مطبع مفید خلائق آگرہ سے منگا لیں ؁

(غالب)

خط ۵

خاں صاحب عالی شان مردان علی خاں صاحب کو فقیر غالب کا سلام۔ نظم و نثر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آج اس فن میں تم یکتا ہو خدا تم کو سلامت رکھے۔ بھائی! جفا کے مؤنث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ کہیگا۔ کہ جفا کیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں۔ کہ ہتھنی آیا۔ اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں۔ ورنہ ستم و ظلم و بیداد مذکر اور جفا مؤنث ہے بے شبہہ و شک والسلام ؁

(غالب)

خط ۶

بندہ نواز! زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قوائے غالب	وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط کتابت رہتی ہے۔ اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے۔ اُن میں سے جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں۔ اُن سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروّج میں مکاتبت و مراسلت کا اتّفاق ہوتا ہے۔ پارسی مکتوبوں۔ رسالوں۔ نسخوں اور کتابوں کے مجموعے شیرازۂ بستہ ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے۔ جان کنی کے خیالات نے مجکو ان کی تحریر سے دست بردار آزاد و سُبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموع و یک جا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آیندہ ہوں اُنھیں کو جناب احدیت جلّت عظمتہٗ مقبول قلوب اہلِ سخن و مطبوع طبائع اربابِ فن فرمائے۔ میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہنچکر آفتاب لب بام اور ہجوم امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خُدا بھی چاہیئے۔ نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اُس نے چاہا۔ تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہیگا۔ پس اُمیدوار ہوں۔ کہ آپ اِنھیں نذور محقّرہ یعنی تحریرات روزمرّہ اُردوے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں۔ اور درویش دلریش و فرو ماندۂ کشاکش

معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دُعا مانگیں۔ اللہ بس ماسوائے ہوس تعقیدِ معنوی کو حضور خود جانتے ہونگے۔ اِس کی توضیح و تفصیل میں تحصیل حاصل و تطویل لاطائل کی صورت نظر آتی ہے۔ لہذا خامہ فرسائی بروے کار نہیں آئی ؂

(غالب)

خط ۷

سُبحان اللہ! سرِ آغازِ فصل میں ایسے ثمر ہاے بیش رس کا پُہنچنا نویدِ ہزار گونہ میمنت و شادمانی ہے۔ یہ ثمر ربّ النوع اثمار ہے۔ اس کی تعریف کیا کروں۔ کلام اس باب میں کیا چاہتا ہوں۔ کہ میں یا درہا اور اہدا کا آپ کو خیال آیا۔ پروردگار آپ کو بااین ہمہ والا پروری و کرم گستری و یاد آوری سلامت رکھے۔ جمعہ کے دن دوپہر کے وقت کہار پُہنچا۔ اور اُسی وقت جواب لے کر اور آم کے دو ٹوکرے دے کر روانہ ہوگیا۔ یہاں سے اُس کو حسبُ الحکم کچھ نہیں دیا گیا ؂

(غالب)

خط ۸

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پُہنچے۔ مکرمی مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی کا قول سچ ہے۔ اب میں تندرست ہوں پھوڑا پھُنسی کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدّت ہے۔ کہ خُدا کی پناہ! ضعف کیونکر نہ ہو! برس دن صاحبِ فراش رہا ہوں۔ ستر برس کی

عمر۔ جتنا خون بدن میں تھا۔ بے مبالغہ آدھا اُس میں سے پیپ ہوکر نکل گیا۔ سن کہاں؟ جو اَب پھر تولیدِ دمِ صالح ہو۔ بہرحال زندہ ہوں اور ناتوان اور آپ کی پرسشہائے دوستانہ کا ممنون احسان۔ والسلام مع الاکرام ؕ

(غالب)

خط ۹

پیر و مرشد! نواب صاحب کا وظیفہ خوار۔ گویا اُس در کا فقیر۔ تکیہ دار ہوں مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا۔ میں کہاں اور بریلی کہاں! ۱۲۔ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرط حیات آخر دسمبر تک دہلی جاؤنگا۔ نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمائشگاہ کی سیر میں جس کو دُنیا کہتے ہیں۔ دِل بھر گیا۔ اب عالمِ بیرنگی کا مشتاق ہوں لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ ؕ

(غالب)

خط ۱۰

قبلہ! آپ بے شک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک ہفتہ گذرا ہوگا۔ کہ ایک امرِ جدید مقتضی اِس کا ہوا۔ کہ آپ کو اُس کی اطلاع دوں۔ خانۂ کاہلی خراب! آج لکھوں۔ کل لکھوں۔ اب کون لکھے! کل صبح کو لکھوں گا۔ صبح ہوئی۔ غالب! اِس وقت نہ لکھ۔ سہ پہر کو لکھیو۔ آج دو شنبہ ۲۳۔ جولائی کی بارہ پر دو بجے ہرکارہ نے

آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اُسی طرح جواب لکھا۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا۔ مگر بھجوا دیا کل روانہ ہو رہیگا ٭ آپ کو معلوم رہے۔ کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفٰے خاں حسرتی کو کبھی اُردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشائے اِصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے "کہار آیا۔ خط لایا۔ آم پہنچے۔ کچھ بانٹے۔ کچھ کھائے۔ بچّوں کو دُعا۔ بچّوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام" یہ تحریر اِس ہفتہ میں گئی ہے۔ غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعۂ نثر اُردو کہاں ہے! یقین جانتا ہوں۔ کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کرینگے ٭ کتاب کے باب میں سرمدی کی رُباعی کا شعر اخیر لکھ دینا کافی ہے :۔

عالم ہمہ مرآت جمال ازلی ست		مے باید دیدو دم نہ باید زد

بوستان خیال کا ترجمہ موسوم بہ حدائق الانظار معرض طبع میں ہے۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو۔ تو جتنے مجلّد فرمائیے۔ اُس قدر بھجوا دوں۔ چھ روپیہ مع محصول ڈاک قیمت ہے۔ اُسی مطبع میں جس میں حدائق الانظار کا انطباع ہوا ہے۔ اخبار بھی چھاپا جاتا ہے۔ اب کے ہفتہ کا دو ورقہ بھیجدونگا۔ بشرط پسند آپ توقیع خریداری لکھ بھیجیئے گا ٭ جناب کیمسن صاحب افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا۔ کچھ اُردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اُس

کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اُردو طلب کی تھی۔ مجموعۂ نظم بھیجدیا۔ نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا۔ مگر یہ لکھا۔ کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصولِ اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دونگا۔ زیادہ حدِ ادب۔ نامۂ جواب طلب

(غالب)

خط ۱۱

قبلہ! پیری و صد عیب۔ ساتویں دہا کے کے مہینے گن رہا ہوں۔ تولنج آگے دَوری تھا۔ اب دائمی ہو گیا ہے۔ مہینا بھر میں پانچ سات بار فضول مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی نشاءِ حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے اگر مفقود نہ کہو۔ تو بمنزلۂ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔ ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں جس کی شدت سے بُھنا جاتا ہوں اگرچہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں۔ مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا۔ کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں ÷ میرے ایک رشتہ کے بھتیجے نے بوستان خیال کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اُس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ اُس کا نہ بصورت پارسل بلکہ بلفِ خط ہذا بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ ہے۔ سو نقل کر لیجئے۔ میرا مُدّعا اِس دو ورقہ کے ارسال سے یہ ہے۔ اگر آپ کی پسند آئے یا اور اشخاص خریدنا چاہیں۔ تو مجھ روپیہ قیمت اور محصول ذمہ خریدار رہے ÷

(غالب)

از مؤلّف

جنگ مرہٹہ و دُرّانی

احمد شاہ والیِ کابل ہندوستان پر تین حملے کر چکا تھا۔ اور صوبۂ پنجاب کو ممالکِ محروسہ میں شامل کر کے نجیب الدولہ روہیلہ کو شاہِ دہلی کی امداد کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ مگر مغلیہ اُمرا کو خود غرضی اور نا اِتّفاقی کے مرض نے ایسا چر لیا تھا کہ ایک کو ایک کھائے جاتا تھا۔ اِدھر عماد الملک وزیرِ دہلی مرہٹوں اور جاٹوں کو نجیب الدّولہ پر چڑھا لایا اُدھر آدینہ بیگ خاں سابق صوبہ دار پنجاب نے مرہٹوں اور سکھوں کی کمک لے کر دُرّانیوں کو اٹک پار بھگا دیا۔ اب سواحل دکن سے وادیٔ اٹک تک مرہٹوں کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ اور ہندوستان کی کھونٹ کھونٹ میں اُن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ناچار نجیب الدّولہ نے احمد شاہ کو عرضی لکھی۔ کہ "حضور والا جلد تشریف لائیں اور ہماری ننگ و ناموس کو مرہٹوں کے دستِ تعدّی سے بچائیں۔ ورنہ یہ قوم تختِ مغلیہ کو اُلٹ دیگی۔ اور ہمارا نام و نشان ہندوستان سے مٹا دیگی" ؛

اِس عرضداشت کو پڑھکر احمد شاہ پھر عازمِ ہند ہوا اور زیرِ دامنِ کوہ ہمالہ کوچ کرتا ہوا۔ بلا تعرّض سہارنپور تک آ پہنچا۔ یہاں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں وغیرہ سرداران روہیلہ باریاب ملازمت ہوئے اور دُرّانی فوج کی کمک لیکر مرہٹوں کو نواحِ دہلی سے مار پیٹ کر نکال دیا

اور جب تک چنبل پار نہ ہو گئے۔ اُن کا پیچھا نہ چھوڑا ؛
مرہٹوں کا سردار راگھو باجی ہندوستان سے جب اس ناکامی کے ساتھ واپس گیا۔ تو بھاؤ جو مرہٹوں کا وزیرِاعظم اور سپہ سالار تھا۔ اُس کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکی۔ اُس وقت مرہٹوں کا اقتدار مُنتہاے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ آراستہ رسالے۔ باقاعدہ پلٹنیں اور عمدہ توپخانے اُن کے پاس موجود تھے۔ اُن کے دربار کی شان و شکوہ بھی مُغلیہ دربار سے ہمسری کا دم بھرتی تھی۔ لہذا بھاؤ ایک لشکرِ عظیم فراہم کر کے بڑے کرّ و فر کے ساتھ دلّی کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ مغلیہ سلطنت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر پھینک دے اور اِس کلخ کہن کی اینٹ سے اینٹ بجادے۔ جب وہ دِلّی کے زیرِ فصیل آپہنچا۔ تو دُرّانیوں کی قلیل جماعت ایک خفیف مقابلہ کے بعد پسپا ہو گئی۔ بھاؤ نے دلّی پر قابض ہو کر مساجد و مقابر و محلّات شاہی کو خوب تاراج کیا۔ دربارِ عام کا نقرئی کٹہرا اُکھڑوا کر اور بیگمات کا زیور تک اُتروا کر گلا ڈالا۔ اگر اور سردار مانع و مزاحم نہ ہوتے۔ تو بھاؤ آمادہ تھا۔ کہ بسواس راؤ کو تختِ دہلی پر بٹھائے اور چاردانگ ہند میں مرہٹوں کا سکّہ چلائے۔ مگر یہ کام اُس وقت تک ملتوی کیا گیا۔ کہ دُرّانیوں کو ہزیمت دے کر اٹک پار بھگادیں۔ اس لئے مرہٹوں کا لشکر آگے بڑھا اور کنج پورہ کے قلعہ کو جہاں معدودے چند دُرّانی قابض و متصرّف تھے محصور کر لیا ؛

اِس وقت احمد شاہ دُرّانی گنگا کنارے **انوپ شہر** کے مقام پر چھاؤنی ڈالے پڑا تھا اور شجاع الدولہ کو اپنی رفاقت پر مائل کر رہا تھا مرہٹوں کی یورش کے اخبار وحشت آثار سن کر اُس نے چھاؤنی توڑی اور محصورین کنج پورہ کی اعانت کے لئے بر سبیل استعجال روانہ ہوا۔ **باغپت** کے گھاٹ پر اُس نے دریائے جمن کو عبور کرنا چاہا۔ مگر دریا تھا طغیانی پر اور اسباب گزارہ مفقود۔ ناچار اور آگے بڑھا اور کنج پورہ کے محاذات میں پہنچکر اُس نے ایک تیر ترکش سے نکالا۔ اُس پر کچھ دم کر کے دریا میں پھینکا۔ اور لشکر کو حکم دیا۔ کہ فوراً گھوڑے دریا میں ڈالدو۔ وہ خُدا کے حکم سے تم کو راستہ دیگا۔ اِس تدبیر سے اُس کا سارا لشکر پار اُتر گیا۔ یہاں خبر لگی۔ کہ ایک دستہ فوج مرہٹہ کا **سنبھالکہ** کے سرائے پر قابض ہے۔ لہذا قشون دُرّانی کا ہراول اُن کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ اور کامیاب ہوا۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی فتح تھی۔ مگر دُرّانی لشکر اسکو فال فیروزی سمجھکر بہت خوش ہوا ٭

اب دُرّانیوں کی آمد آمد سن کر مرہٹوں نے بھی کنج پورہ سے کوس مراجعت بجایا۔ اور دونوں لشکر نواحی پانی پت میں خیمہ زن ہوئے۔ مرہٹوں کے لاؤ لشکر کی بھیڑ بھاڑ اس قدر تھی۔ کہ آج تک نو لاکھ نیزہ زبان زد عوام ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنگ مہابھارت کے بعد سرزمین ہند میں ایسا جمگھٹ فوجوں کا کبھی نہیں ہوا۔ خیر یہ سب مبالغہ سہی۔ مگر اس میں شک نہیں۔ کہ مرہٹوں کی جمعیت مع بُھیر و بنگاہ بقول

بعض تین لاکھ اور بقول بعض پانچ لاکھ کے قریب تھی۔ خاص قشونِ دُرّانی چالیس ہزار اور ہندوستانی سرداروں کی ماتحت فوجیں پچاس ہزار تھیں مرہٹوں کا توپخانہ دو سو توپوں سے زیادہ۔ مگر دُرّانیوں کی طرف صرف تیس ۳۰ توپیں تھیں۔

کچھ عرصہ تک دونوں لشکر مقابل ہمدگر پڑے رہے۔ اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چنانچہ ایک بار بھاؤ کے حکم سے گوبند رائے بُندیلہ ایک دستہ فوج کا لیکر روہیلکھنڈ و اودھ پر تاخت کرنے کے لئے نکلا۔ ہندوستانی سرداروں نے یہ خبر شاہ دُرّانی کو پہنچائی۔ شاہ نے سردار عطائی خاں کو جو قندھار سے تازہ وارد ہُوا تھا اُس کے مقابلہ کو روانہ کیا۔ سردار مذکور اپنے ماتحت سواروں اور کچھ روہیلوں کو ساتھ لے راتوں رات یلغار کر کے صُبحدم گوبند رائے کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اُس کو تہس نہس کر کے گوبند رائے کا سر شام تک بادشاہ کے سامنے لا رکھا۔ گاہ بگاہ رسد لانے والے گروہوں میں بھی جھڑپ ہو جاتی تھی۔ غرض کئی مہینے تک پڑے پڑے طرفین کے سپاہی اور سردار تنگ آ گئے۔ اِدھر تو ہندوستانی سردار احمد شاہ سے ملتجی ہوئے۔ کہ ایک فیصلہ کی جنگ کیجیے۔ جو ہونا ہو سو ہو جائے۔ اُدھر مرہٹے سردار بھاؤ سے متقاضی تھے۔ کہ لشکر میں غلّہ اور سامان کا قحط ہے۔ یوں فاقوں مرنے سے تو بہتر ہے۔ کہ برسرِ میداں لڑ کر مریں ؎

آخرِ کار شجاع الدولہ کی وساطت سے مرہٹوں نے صُلح کا پیغام

بھیجا۔ احمد شاہ نے جواب دیا۔ کہ جنگ و پیکار کا معاملہ میری رائے پر رکھو اور صلح کرنی ہو تو تم لوگ مختار ہو۔ جو اپنے حق میں مصلحت سمجھو کرو۔ شجاع الدولہ تو صلح و آشتی پر مائل تھا۔ اِلّا نجیب الدولہ اڑ بیٹھا اور سب ہندوستانی سرداروں کو سمجھایا۔ کہ اگر اس وقت مرہٹے کورے نکل گئے۔ تو یاد رکھنا کہ آیندہ تمھاری خیر نہیں۔ غرض صلح کا معاملہ جھمیلے میں پڑ گیا۔ دو ٹوک فیصلہ قرار نہ پایا ؛

ابھی پیک و پیام آجا رہے تھے۔ کہ آخر شب کو جاسوسوں نے خبر دی کہ مرہٹوں کا لشکر ایک زبردست حملہ کی تیّاری میں مصروف ہے یہ خبر شجاع الدّولہ نے احمد شاہ کو پہنچائی۔ وہ اپنے خیمہ سے ہتھیار لگائے باہر آیا اور فوج کو آگے بڑھنے کا حکم سُنایا۔ مگر شاہ کو اِس خبر کی صحّت میں ہنوز تردُّد تھا۔ کہ یکایک مرہٹوں کے توپخانہ کی زبردست فیر نے اُس کی تصدیق کردی ؛

جب مرہٹوں کا توپخانہ باہستگی آگے بڑھتا چلا آیا۔ یہانتک کہ اُس کے گولے دُرانی لشکر کے سر پر سے گزرنے لگے۔ تو مرہٹوں کے جنرل ابراہیم گردی نے فیر بند کرادی اور اپنی پلٹنوں کو آگے بڑھا کر سنگینوں سے حملہ کیا ؛

اس حملہ نے روہیلوں کی صف کو جو دُرّانیوں کے بازوئے راست کی محافظ تھی بالکل زیر و زبر کردیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی ایک تازہ دم فوج سے بسواس راؤ نے دُرّانیوں کے قلب لشکر پر جہاں احمد شاہ

کا وزیر حکم رانی کر رہا تھا۔ سخت یورش کی۔ اس چپقلش میں وزیر کا برادر زادہ عطائی خاں کام آیا۔ اور دُرّانیوں کے قدم اُکھڑنے لگے۔ یہ کیفیّت دیکھ کر وزیر اور اُس کے رُفقا گھوڑوں سے کود پڑے اور عزمِ بالجزم کر لیا کہ بغیر مَرے مارے میدان کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔

اس وقت گرد و غبار کی وجہ سے ہنگامۂ نبرد کا کچھ حال معلوم نہ ہوتا تھا کہ کون غالب اور کون مغلوب ہے؟ مگر دُرّانیوں کے نعرے اور اُن کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کم ہوتی جاتی تھی۔ اس لیئے احمد شاہ نے فوراً ایک دستہ وزیر کی کُمک کے لئے عقب سے روانہ کیا۔ اُس کے پہُنچتے ہی پھر گرما گرمی سے آتش جدال و قتال مشتعل ہو گئی اور خوب جم کر گھما گھمی سے لڑائی ہونے لگی۔ طرفین کے دلاور سورما دست بدست اور سینہ بسینہ ڈٹ گئے۔ کہیں تلوار سے تلوار اور کہیں کھانڈے سے کھانڈا بج رہا تھا۔ نیزوں کی سِنانیں اور سنگینوں کی نوکیں برقِ خاطِف کے مانند کوند رہی تھیں۔ بھاؤ اور بسواس اپنی فوجوں کو بڑھا بڑھا کر مردانہ وار لڑ رہے تھے۔ ظاہر مرہٹوں کا پلّہ بہت بھاری نظر آتا تھا اور دُرّانی دبتے چلے جاتے تھے۔ مگر عینِ وقت پر احمد شاہ کو وہ چال سوجھی کہ طرفۃ العین میں بازی کا رنگ بدل گیا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق سوارانِ صف شکن کا دستہ۔ جو اُس کی فوج کا چیدہ حصّہ تھا۔ گھوڑوں کو سرپٹ اُڑاتا کاوا کاٹ کر نکلا۔ اور یکایک غنیم کے بائیں بازو پر نہایت جوش و خروش کے ساتھ ٹوٹ پڑا ؛

یہ حملہ نہ تھا۔ بلکہ سحر و افسوں تھا۔ جس کے اثر سے مرہٹوں کی دَل بادَل فوجیں کائی کی طرح پھٹ گئیں۔ کچھ ایسی ہَل چل مچی۔ کہ بالکل حواس باختہ ہو گئے اور جیتی جتائی بازی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ پھر تو دُرّانیوں اور روہیلوں نے وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے کہ کشتوں کے پُشتے اور مقتولوں کے انبار لگا دیے۔ بیس بیس کوس تک غنیم کا پیچھا دبائے چلے گئے اور جہاں مرہٹہ سپاہی پایا۔ وہیں اُس کو ٹھکانے لگا یا یہاں تک کہ اسیرانِ جنگ پر بھی کچھ رحم نہ کیا۔ جو اُن کی تیغ بے دریغ سے بچ نکلا۔ اُس کو دہقین نے سنگوایا۔ بھاؤ۔ بسواس اور دیگر چیدہ سردار مرہٹوں کے وہیں کھیت رہے۔ صرف ہُلکر اور سیندھیا زندہ بچے ؛

جب بقیۃ السیف اپنے مُلک میں پہنچے ہیں۔ تو تمام دکن میں گھر گھر کہرام مچ گیا۔ کوئی قریہ اور قصبہ ایسا نہ تھا۔ جہاں سے نالہ و فغاں کی صدا بلند نہ ہوئی ہو۔ ایسی خوفناک تباہی مرہٹوں پر کبھی نہ پڑی تھی اور بعد ازاں پہلی سی شان و شوکت اُن کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ مؤرخین دقیقہ سنج نے مرہٹوں کی ہزیمت کا سبب یہ قرار دیا ہے۔ کہ وہ زورِ بازو و نیروے جسمانی میں خلقۃً اپنے حریف کے مدِّ مقابل نہ تھے۔ اس لئے شدائد جنگ و مصائب رزم کو زیادہ برداشت نہ کر سکے ؛

(محمد اسمٰعیل)

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ نام سرور تخلص لکھنؤ کے رہنے والے۔ واجد علی شاہی دور کے بڑے مشہور نثار مقفّٰی نگار تھے۔ یہ طرز انشا جو کہ سراسر تکلّف تھی۔ اُس پُر تکلف زمانہ میں چندے مقبول رہی۔ مگر اب تو بالکل مُردہ و افسردہ ہو گئی ہے ؛

جاڑے کی شدّت

ناگاہ ایک روز گذر موکب حشمت و جلال۔ با فرّ و شوکت کمال۔ ایک صحرائے باغ و بہار دشت لالہ زار میں ہوا۔ فضائے صحرا قابل تحریر کیفیت دشتِ گلشن آسا لائق تقریر۔ بو باس ہر برگ گل کی رشکِ مشک اذفر صفحۂ بیابان معنبر و معطّر۔ چشموں کا پانی صفا میں آب گوہر سے آبدار تر۔ ذائقہ میں بہ از شیر و شکر۔ چلنے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی۔ گویا کہ زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ پرند اور چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے بھوک اور پیاس کے صدمے اُٹھاتے تھے۔ دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے۔ قصد سے تھر تھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دمِ تقریر ہر شخص کے مُنھ سے دُھواں دھار دُھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی۔ مُنھ سے بات باہر آتی اور جم جاتی تھی۔ مار سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔ سردی کے باعث دُم دبا کے پانی میں بھاگ جاتا تھا۔

زمانہ کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا۔ اشک شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا۔ پروانوں نے پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا۔ شعلہ کانپتا تھا۔ فانوس کے لحاف میں منھ ڈھانپتا تھا۔ شمع کا جسم برف تھا۔ پگھلنے کا کیا حرف تھا۔ ہر سنگ کے سینہ میں آگ تھی۔ گواہ شرعی شرر تھا۔ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی۔ اور جاڑے کا ایسا اثر تھا۔ کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں۔ فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔ تنور فلکِ چارم کی چھاتی سرد تھی۔ گلخن میں یہ برودت تھی کہ کشمیر گرد تھی۔ کُنجوں نے بٹیر پکڑے۔ لوے لُولوں کے ہاتھ آئے۔ لنگڑے ہرن باندھ لائے۔ سرزمین ہند میں مُردے نہ جلتے تھے۔ زندوں کے ہاتھ پاؤں گلتے تھے۔ آتشِ رخسارِ گُل شبنم نے بجھائی تھی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ اُس برگ و بار کی صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی۔ مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشک شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے۔ ہر شجر کے پتّے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔ عذارِ لالۂ حمرا رشک زعفراں تھا۔ طلائی درختوں کی ٹہنیاں۔ کہربائی پتّے۔ بہاریں رنگ خزاں تھا۔ اس سردی کا کہیں ٹھکانا تھا۔ حمّام تہ خانہ کا خس خانہ تھا۔ آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے۔ زردشت کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔ آفتاب عازمِ بُرج حمل تھا۔ آتش پرستوں کا عمل تھا۔ زلیست سمندر کے عنوان تھی۔ آگ میں خلقت کی جان تھی۔ جاڑے

میں ہر ایک المست تھا۔ عالم اللہ کا آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اُس دشت میں ایسا پالا پڑا۔ تمام اہلِ لشکر کو تپ لرزہ چڑھا۔ بانکے ترچھے اینٹھے جاتے تھے۔ ڈھال تلوار کھڑکھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے۔ تمنچے۔ چقماق۔ پتھر کلے لاٹھی سے بیکار ہو گئے تھے چانپ کے پتھر آگ نہ دیتے تھے۔ اور توڑے دار کا یہ حال تھا بوجھ کندھا توڑے دیتا تھا۔ قدم اُٹھانا محال تھا۔ توڑا ہر ایک گُل تھا۔ توتے کی جگہ شورِ بُلبُل تھا۔ ہوش لوگوں کے کانپتے تھے۔ کیمچڑے کی مٹّی کو الاؤ سمجھ پھونکتے ہانپتے تھے۔ ملائم لوگوں کے حواس جم گئے تھے۔ جگنو کو چنگاری کے دھوکے اُٹھانے کو تھم گئے تھے۔ سردی بسکہ کارفرما تھی۔ ایک کو دوسرے کی تمنّا تھی۔ یہاں تک جاڑے کا زور شور عالمگیر ہوا تھا کہ کرۂ نار زمہریر ہوا تھا:۔

(سُرور لکھنوی)

میر امّن دہلوی رح

میر امّن دلی کے رہنے والے تھے۔ بتلاش معاش چندے عظیم آباد میں قیام کیا۔ وہاں سے چل کر کلکتہ پہنچے۔ جان گلگرسٹ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ صاحب موصوف کی فرمائش سے ۱۸۰۱ء میں قصۂ چار درویش کو فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی نثر اُس زمانہ کے روزمرہ اُردو اور محاورات دہلی کا نہایت فصیح و صحیح نمونہ ہے۔

قصّہ

یہ کمترین بادشاہ زادہ عجم کا ہے۔ میرے ولی نعمت وہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ جوانی کے عالم میں مصاحبوں کے ساتھ۔ چوپڑ۔ گنجفہ۔ شطرنج۔ تختۂ نرد کھیلا کرتا۔ یا سوار ہوکر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے۔ کہ سواری تیار کروا کر اور سب یاروں آشناؤں کو لیکر میدان کی طرف نکلا۔ باز۔ بہری۔ بجرہ۔ باشہ۔ سرخاب اور تیتروں پر اُڑاتا ہوا دور نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک قطعہ بہار کا نظر آیا۔ کہ جدھر نگاہ جاتی کوسوں تک سبزے اور پھولوں سے زمین لال نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھکر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے۔ ناگاہ اُس صحرا میں دیکھا کہ ایک کالا ہرن۔ اُس پر زربفت کی جھول اور بھنور کلی مُرصّع کی۔ اور گھنگرو سونے کے زردوزی پٹّے میں ٹکے ہوئے گلے میں پڑے

خاطر جمع سے اُس میدان میں کہ جہاں اِنسان کا دخل نہیں اور پرندہ پر نہیں مارتا۔ چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُم کی آہٹ پا کر چونکنا ہوا۔ سر اُٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا۔ کہ رفیقوں سے کہا" تم یہیں کھڑے رہو۔ میں اسے جیتا پکڑ دوں گا خبردار! تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو" اور گھوڑا میری رانوں تلے ایسا پرند تھا۔ کہ بارہا ہرنوں کے اوپر دوڑا کر۔ اُن کی کرچھالوں کو بھلا کر ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیتے تھے۔ اُس کے عقب دوڑایا۔ وہ دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا اور ہُوا ہوا۔ گھوڑا بھی باؤ سے باتیں کرتا تھا۔ لیکن اُس کی گرد کو نہ پہونچا۔ وہ رہوار پسینہ پسینہ ہوگیا اور میری بھی جیبھ مارے پیاس کے چٹخنے لگی۔ پر ہرگز کچھ بس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور میں کیا جانوں! کہاں سے کہاں نکل آیا؟ ناچار ہو کر اُس کو بھلا وا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر اور قربان سے کمان سنبھال کر چلّے میں جوڑ کشش کان تک لا کر ران کو اُس کی تاک "اللہ اکبر" کہہ کر مارا بارے پہلا ہی تیر اُس کے پاؤں میں ترازو ہوا۔ تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اُتر پیادہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُسی کوہ کا ارادہ کیا اور اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاؤ کے بعد ایک گنبد نظر آیا۔ جب پاس پہونچا ایک باغچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرن تو نظروں سے چھلاوہ ہوگیا۔ میں نہایت تھکا تھا۔ ہاتھ پاؤں دھونے لگا۔ ایک بارگی آواز رونے کی اُس بُرج کے اندر سے میرے کان میں

آئی۔ جیسے کوئی کہتا ہے"۔اے بچے! جس نے مجھے تیر مارا میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو۔ وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خُدا اُس کو میرا سا دُکھیا بنا دے"میں یہ سُن کر وہاں گیا۔ تو دیکھا۔ کہ ایک بزرگ ریش سفید اچھی پوشاک پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہے۔ اُسکی جانگ سے یہ تیر کھینچتا ہے اور بد دعا دیتا ہے میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ کہ"حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اِس غلام سے ہوئی۔ خدا کے واسطے معاف کرو"۔ بولا کہ بے زبان کو تو نے ستایا ہے۔ اگر انجان تجھ سے یہ حرکت ہوئی۔ تو اللہ معاف کرے گا"۔ میں پاس جا بیٹھا۔ اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دقت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دُھو دھا کر اُس پیر مرد نے حاضری جو اُس وقت موجود تھی مجھے کھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لمبی تانی۔ ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھر کر سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ و زاری کی کان میں آئی آنکھیں ملکر جو دیکھتا ہوں۔ تو نہ اُس مکان میں وہ بوڑھا ہے۔ نہ کوئی اور ہے۔ اکیلا میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے *

(میر امّن دہلوی)

تمام شد حصۂ نثر

حصۂ نظم

مثنویات

از خواجہ الطاف حسین حالی

حُبِّ وطن

اے سپہرِ بریں کے سیّارو! اے فضائے زمیں کے گلزارو!

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا! اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا!

اے عنادِل کے نغمۂ سحری! اے شبِ ماہتاب تاروں بھری!

اے نسیمِ بہار کے جھوکو! دہرِ ناپائدار کے دھوکو!

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رمنا تم سے دِل باغ باغ تھا اپنا

تم مِری دل لگی کے ساماں تھے تم مِرے دردِ دل کے درماں تھے

تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی تم سے پاتا تھا دِل شکیبائی

آن اِک اِک تمہاری بھاتی تھی جو ادا تھی وہ جی لُبھاتی تھی

کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے ہو کے خوشحال۔ گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب دھو کے اُٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھُٹا جب سے اپنا مُلک و دیار جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گُلوں کی ادا خوش آتی ہے نہ صدا بُلبلوں کی بھاتی ہے
سیرِ گلشن ہے جی کا اِک جنجال شبِ مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اَور یا تمہارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دُنیا پر نہیں ہم کو لطف دُنیا کا
اے وطن! اے مرے بہشتِ بریں! کیا ہوے تیرے آسمان و زمیں؟
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دُوری ہے مورِدِ آلام تیرے چھُٹنے سے چھُٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بِن تیرے گُل ہیں نظروں میں داغ بِن تیرے
مِٹ گیا نقش کامرانی کا تجھ سے تھا لُطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دُور سدا اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا
ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال! تجھ بِن اِک ایک پل ہے اِک اِک سال
سچ بتا دو تو سبھی کو بھاتا ہے یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار یا کہ سب تجھ پہ ہیں فدا اے یار!

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں ؟　　اے وطن ! تو تو ایسی چیز نہیں
جن و انسان کی حیات ہے تو　　مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کو نمو تجھ سے　　رُوکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما　　سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اِک مشتِ خاک کے بدلے　　لوں نہ ہرگز۔ اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جُدا　　کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جُدا
اے دل ! اے بندۂ وطن ! ہُشیار !　　خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار
او نشاطِ خودی کے متوالے !　　گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے !
نام ہے کیا اِسی کا حُبِّ وطن ؟　　جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچّوں کا دھیان آتا ہے　　کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی　　لو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی
نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار　　پھرتے آنکھوں میں ہیں دَر و دیوار
کیا وطن کی یہی محبت ہے ؟　　یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے
اِس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند　　اِس سے خالی نہیں چرند و پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں　　سُوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں
جا کے کابُل میں آم کا پَودا　　کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آ کے کابُل سے یاں بہی و انار　　ہو نہیں سکتے بار وَر زنہار
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے　　ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
آگ سے جب ہوا سمندر دُور　　اُس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں — جان کے اُن کی لالے پڑتے ہیں
گائے یا بھینس اونٹ یا بکری — اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی
کہیئے حُبِّ وطن اِسی کو اگر — ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر
بیٹھے بے فکر کیا ہو۔ ہموطنو! — اُٹھو! اہلِ وطن کے دوست بنو
مَرد ہو تو کِسی کے کام آؤ — ورنہ کھاؤ۔ پیو چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لُطف اُٹھاؤ — دِل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دِلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تُم پوشاک — کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ۔ تو جی میں تم شرماؤ — ٹھنڈا پانی پیو۔ تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار — زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا — اُن کو وہ خواب میں نہیں مِلتا
جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو — واں مُیسّر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ۔ تو پہلے لو خبر اُن کی — جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو۔ تو پہلے بھائیوں کو پنہاؤ — کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر — ہے کوئی اُن میں خشک کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند — کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند
مُقبلو! مُدبروں کو یاد کرو — خوشدلو! غم زدوں کو شاد کرو
جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر — لو جو لی جائے کور و کر کی خبر

(حالی)

برکھا رُت

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لئے کتاب عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی — وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات! — وہ کون؟ خُدا کی شان برسات!
آئی ہے بہت دُعاؤں کے بعد — اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اِک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے — اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رِسالے — گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی — اِک آتی ہے فوج ایک جاتی
جاتے ہیں مُہم پہ کوئی جانے — ہمراہ ہیں لاکھوں توپخانے
توپوں کی ہے جبکہ باڑھ چلتی — چھاتی ہے زمین کی دہلتی
منھ کا ہے زمین پر دڑیڑا — گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی — آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگور گھٹائیں چھا رہی ہیں — جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی — قدرت ہے نظر خُدا کی آتی
سورج نے نقاب لی ہے مُنھ پر — اور دُھوپ نے تہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحّت — کھیتوں کو مِلا ہے سبز خلعت

سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور — ہے چار طرف برس رہا نور
بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار — اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی — عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار — دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل — ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے "پیہو پیہو" — اور مور جھنگارتے ہیں ہرسو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی — گویا کہ ہے دِل میں بیٹھی جاتی
مینڈک ہیں جو بولنے پہ آتے — سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے
سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر — پانی میں نگر مچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست — فلاّش ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر — کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

از مثنوی سحرالبیان مصنفۂ میر حسن دہلوی

میر غلام حسن نام۔ حسن تخلص۔ شرفائے دہلی سے تھے۔ فن سخن میں میر دردؔ اور مرزا سوداؔ سے مشورہ کرتے تھے۔ ایام شباب میں دلّی سے فیض آباد آئے۔ پھر لکھنؤ۔ وہیں یہ مثنوی لکھی۔ جس سے بہتر اُردو میں کوئی مثنوی نہیں ہوئی۔ بیان سادہ پُر تاثیر اور محاورہ کی خوبیوں سے معمور۔ جس معاملہ کو بیان کیا ہے اُس کی تصویر کھینچ دی ہے۔

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم — جُھکا جس کے سجدہ کو اوّل قلم
سرِ لوح پر رکھ بیاضِ جبیں — کہا "دوسرا کوئی تجھ سا نہیں"
قلم پھر شہادت کی اُنگلی اُٹھا — ہوا حرف زن یوں کہ "ربّ العلا!"

نہیں کوئی تیرا۔ نہ ہوگا شریک
تری ذات ہے وَحدَہٗ لاشریک

پرستش کے قابل ہے تو اے کریم!
کہ ہے ذات تیری غفور الرّحیم

رہِ حمد میں تیری عَزَّ وَجَل
تجھے سجدے کرتا چلوں سر کے بل،

وہ الحق۔ کہ ایسا ہی معبود ہے
قلم جو لکھے۔ اُس سے افزود ہے

تر و تازہ ہے اُس سے گلزارِ خلق
وہ ابرِ کرم ہے ہوا دارِ خلق

اگرچہ وہ بے فکرِ غیّور ہے
دلے پرورش سب کی منظور ہے

کسی سے بر آوے نہ کچھ کامِ جاں
جو وہ مہرباں ہو۔ تو کُل مہرباں

نہاں سب میں اور سب میں ہے آشکار
یہ سب اُس کے عالم ہیں ہژدہ ہزار

اُسی سے ہے کعبہ۔ اُسی سے کنشت
اُسی کا ہے دوزخ۔ اُسی کا بہشت

وہ ہے مالکُ المُلکِ دُنیا و دیں
ہیں قبضہ میں اُس کے زمان و زمیں

نہیں اُس سے خالی غرض کوئی شے
وہ کچھ شے نہیں۔ پر ہر اک شے میں ہے

نہ گوہر میں ہے وہ۔ نہ ہے سنگ میں
ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

تامّل سے کیجے اگر غور کچھ
تو سب کچھ وہی ہے۔ نہیں اَور کچھ

دیا عقل و ادراک اُس نے ہمیں
کیا خاک سے پاک اُس نے ہمیں

وصفِ سخن

پلا مجھ کو ساقی شرابِ سخن
کہ ہو جس سے مفتوح بابِ سخن

سخن کی مجھے فکرِ دن رات ہے
سخن ہی تو ہے۔ اور کیا بات ہے

سخن کے طلبگار ہیں عقلمند
سخن سے ہے نامِ نکویاں بلند

سخن کی کریں قدر مردانِ کار
سخن نام اُن کا رکھے برقرار

سخن سے وہی شخص رکھتے ہیں کام
جنھیں چاہیئے ساتھ نیکی کے نام

سخن سے سلف کی بھلائی رہی
زبانِ قلم سے بڑائی رہی

کہاں رستم و گیو و افراسیاب
سخن سے رہی یاد یہ نقلِ خواب

سخن کا صلہ یار دیتے رہے
جواہر سدا مول لیتے رہے

سخن کا سدا گرم بازار ہے
سخن سنج اُس کا خریدار ہے

رہے جب تلک داستانِ سخن
الٰہی! رہیں قدر دانِ سخن

سواری کی طیّاری

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھلی گُل جھڑی غم کے جنجال کی

کہا شہ نے بُلوا نقیبوں کو شام
کہ "ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام

سواری تکلّف سے تیّار ہو
مہیّا کریں جو کہ درکار ہو

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند
سواری کا ہو لُطف جس سے دوچند

رعیّت کے خوش ہوں صغیر و کبیر
کہ نکلے گا گل شہر میں بے نظیر"

یہ فرما محل میں گئے بادشاہ
نقیبوں نے سُن حکم - لی اپنی راہ

خوشی میں گئی جلد جو شب گذر
ہوئی سامنے سے نمایاں سحر

عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید
عجب روز تھا مثل روزِ اُمید

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
کہ "بابا! نہا دھو کے تیّار ہو"

ہوا جب کہ داخل وہ حمّام میں
عرق آ گیا اُس کے اندام میں

تنِ نازنیں نم ہوا اُس کا گُل
کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گُل

نہا دھو کے نکلا وہ گُل اِس طرح
کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض شاہزادہ کو نہلا دُھلا — دیا خلعتِ خسروانہ پنھا
نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار — کیے خوان گوہر کے اُس پر نثار
زبس تھا سواری کا باہر ہجوم — ہوا جبکہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم
برابر برابر کھڑے سجے سوار — ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار
وہ ماہی مراتب۔ وہ تختِ رواں — وہ نوبت۔ کہ دولھا کا جیسے سماں
وہ شہنائیوں کی صدا خوش نما — سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا
وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی — قدم با قدم۔ بالباسِ زری
سوار اور پیادے۔ صغیر و کبیر — جلو میں تمامی امیر و وزیر
ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار — چلے سب قرینے سے باندھے قطار
سجے اور سجائے سبھی خاص و عام — لباسِ زری میں ملبّس تمام
غرض اس طرح سے سواری چلی — کہے تو۔ کہ "بادِ بہاری چلی"
رعیت کی کثرت۔ ہجومِ سپاہ — گذرتی تھی رُک رُک کے ہر جا نگاہ
لگا لُنج سے تا ضعیف و نحیف — تماشے کو نکلے وضیع و شریف
نظر جس کو آیا وہ ماہِ تمام — کیا اُس نے جُھک جُھک کے اُس کو سلام
غرض شہر سے باہر اک سمت کو — کوئی باغ تھا شہ کا اُس میں سے ہو
سواری کو پہنچا گئی فوج ادھر — گئے اپنی منزل پہ شمس و قمر
پہر رات تک پہنے پوشاک وہ — رہا ساتھ سب کے طربناک وہ
قضارا وہ شب تھی شبِ چاردہ — پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ
نظارہ پہ تھا اُس کے دل کو سرور — عجب عالمِ نور کا تھا ظہور

عجب لطف تھا سیرِ مہتاب کا — کہے تو۔ کہ دریا تھا سیماب کا
کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ — کہا "آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ
ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا — کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا"
زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا — بچھونے پہ آتے ہی بس سو رہا
جہاں تک کہ چوکی کے تھے باریدار — ہوا جو چلی سو گئے ایک بار

شہزادہ گم ہو گیا

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں — تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہ رو — نہ وہ گل ہے اُس جا۔ نہ وہ اُس کی بو
نہ بن آئی کچھ اُن کو اس کے سوا — کہ کہیے یہ احوال اب شہ سے جا
ہوا گم وہ یوسف۔ پڑی یہ جو دھوم — کیا خادمانِ محل نے ہجوم
شب آدھی وہ جس طرح سوتے کٹی — رہی تھی جو باقی۔ سو روتے کٹی
عجب طرح کی شب تھی ہیہات وہ — قیامت کا دن تھا۔ نہ تھی رات وہ
سحر نے کیا جب گریبان چاک — اُڑانے لگے مل کے سب سر پہ خاک
اُٹھا شہر میں سب طرف شور و غُل — کہ غائب ہوا اس چمن سے وہ گُل
غم و درد سے دل جو سب کا بھرا — ہوا باغ سارا وہ ماتم سرا
وہ لبریز جو نہر تھی جا بجا — سو آنکھوں کو وہ رہ گئی ڈبڈبا
ہوا حال چشموں کا یاں تک تباہ — کیا رخت پانی سے اپنا سیاہ
کہاں وہ کنوئیں اور کدھر آبشار — کوئی دل میں روئے کوئی ڈھاڑ مار
جہاں رقص کرتے تھے طاؤسِ باغ — لگے بولنے اُن منڈیروں پہ زاغ

منقش جہاں تھے جو رنگیں مکاں ہوئے سب وہ جوں دیدہ خونچکاں
گلوں کی طرح کھل رہے تھے جو دل سو وہ سب خزاں سے ہوئے مضمحل
نہ غنچہ نہ گل نے گلستاں رہا فقط دل میں اک خارِ ہجراں رہا
وزیروں نے دیکھا جو احوالِ شاہ کہ ہوتی ہے اب اُس کی حالت تباہ
کہا "گو جُدائی گوارا نہیں ولیکن خُدائی سے چارا نہیں
خُدا کی خُدائی تو معمور ہے غرض" اُس کے نزدیک کیا دُور ہے
یہ کہہ اور شہ کو بٹھا تخت پر بہر نوع رہنے لگے ٹک دگر
لٹایا بہت باپ نے مال و زر ولیکن نہ پائی کچھ اُس کی خبر

شادی کا سماں

بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز چڑھا بیاہنے وہ مہ شب فروز
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار بجے شادیانے بہم ایک بار
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
سپر اور قبضے کھڑکنے لگے سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
ٹکورے وہ نوبت کے اور اُن کے بعد گرجنا وہ دھوسوں کا مانند رعد
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے پتنگے خوشی سے غزل خواں ہوئے
براتی ادھر اور اُدھر جوق جوق وہ آواز سرنا۔ وہ آوازِ بوق
وہ ابرک کی ٹٹی وہ پٹنے کے جھاڑ کہے تو کہ ہر تنکے کی اوجھل پہاڑ"
دو رستہ برابر برابر وہ تخت کسی پر کنول اور کسی پہ درخت
اناروں کا دغنا۔ بھچینے کا زور ستاروں کا چھٹنا۔ پٹاخوں کا شور

وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار
ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار

جب آئی وہ دُلہن کے گھر پر برات
کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات!

بلوریں دھرے شمعداں بے شمار
چڑھیں بتیاں موم کی چار چار

نئے رنگ کے اور نئے طور کے
دھرے ہر طرف جھاڑ بلّور کے

تماشائیوں کی یہ کثرت۔ کہ بس
ملے ایک سے ایک سب پیش و پس

وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا
برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا

ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان
پلا سب کو شربت دیے پاندان

وہ سب ہو چکے جبکہ رسم و رسوم
سواری کی ہونے لگی پھر تو دُھوم

سحر کا وہ ہونا۔ وہ ٹونے کا وقت
وہ دُلہن کی رخصت وہ رونے کا وقت

وہ دُلہن کا رو رو کے ہونا جُدا
وہ ماں باپ کا اور رونا جُدا

نکلتے وہ جانا محل سے جہیز
کہ جوں چشم سے اشک ہو موج خیز

یہاں موت سے ہے اہلِ عرفان کو
کہ جانا ہے اک دن یونہیں جان کو

وہ جو دردمندی سے ہیں آشنا
وہ شادی کا لیتے ہیں غم سے مزا

شہزادہ کا مِلنا

پڑا شہر میں یک بیک پھر یہ غل
کہ غائب ہوا تھا سو آیا وہ گل

خبر یہ ہوئی جبکہ ماں باپ کو
کیا گم اُنھوں نے وہیں آپ کو

لگے رونے آپس میں زار و نزار
کہا" ہائے! ہم کو نہیں اعتبار"

کہا سب نے" صاحب! چلو تو سہی
یہ بیٹا تمھارا وہی ہے! وہی!"

مگر سُنا جب کہ بیٹے کا ناؤں
چلا پھر تو روتا ہوا ننگے پاؤں

جو ہیں اپنے کعبہ کو دیکھا رواں ۔۔۔ چلا سر کے بل بے نظیرِ جہاں
گرا پاؤں پر کہہ کے یہ باپ کے ۔۔۔ "خدا نے دکھائے قدم آپ کے"
سنی یہ صدا جو ہیں اُس ماہ کی ۔۔۔ تو اُس غم رسیدہ نے اِک آہ کی
ملے پھر تو آپس میں وہ خوب سے ۔۔۔ کہ یوسفؑ ملے جیسے یعقوبؑ سے
ہوئے شاد و خرّم صغیر و کبیر ۔۔۔ چلے لیکے نذریں امیر و وزیر
مئے عیش سے سب کو مستی ہوئی ۔۔۔ نئے سر سے آباد بستی ہوئی
در آمد ہوا گھر میں سروِ رواں ۔۔۔ لیے ساتھ اپنے وہ غنچہ دہاں
کہ اِتنے میں آگے نظر جو پڑی ۔۔۔ تو دیکھا۔ کہ ہے راہ میں ماں کھڑی
بہی چشم سے آنسوؤں کی قطار ۔۔۔ گرا ماں کے پاؤں پہ بے اختیار
وہ ماں خوب بیٹے کے لگ کر گلے ۔۔۔ یہ روئی۔ کہ آنسو کے نالے چلے
بہو اور بیٹے کو چھاتی لگا ۔۔۔ وہ دونوں کی دو ہاتھ سے لی بلا
ہوئی جان اور جی سے اُن پر نثار ۔۔۔ پیا پانی اُن دونوں پر وار وار
وہ آنکھیں جو اندھی تھیں۔ روشن ہوئیں ۔۔۔ زمینیں جو تھیں خشک۔ گلشن ہوئیں
زبس باپ ماں کو تھی سہرہ کی چاہ ۔۔۔ دوبارہ اُنھوں نے کیا اُس کا بیاہ
بنا اُن کی تقدیر کا جو بناؤ ۔۔۔ نکالے اُنھوں نے یہ سب دل کے چاؤ
ہوا شہر پر فضلِ پروردگار ۔۔۔ وہی شاہزادہ۔ وہی شہریار
وہی بلبلیں اور وہی بوستاں ۔۔۔ شگفتہ گل و مجمعِ دوستاں

(حسن دہلوی)

از مثنوی گلزار نسیم

پنڈت دیاشنکر تخلص بہ نسیم سرکار اودھ کی فوج میں منشی تھے اور فن سخن میں خواجہ آتش کے شاگرد۔ قصۂ گل بکاؤلی جو پہلے نثر میں تھا۔ اُس کو نظم کرکے گلزار نسیم نام رکھا تشبیہ و استعارہ اور صنائع لفظی و معنوی سے بیان کو آراستہ اور قصہ کو مختصر کیا ہے میر حسن کی مثنوی کے بعد یہ ہی مثنوی ہے جو مقبول عام ہوئی

۱

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری — ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر — حمد حق و مدحتِ پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی — کرتا ہے زباں کی پیش دستی

۲

روداد زمانِ باستانی — یوں نقل ہے خامہ کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ — سلطان زین الملوک ذیجاہ
لشکر کش و تاجدار تھا وہ — دشمن کش و شہریار تھا وہ
خالق نے دیے تھے چار فرزند — دانا۔ عاقل۔ ذکی۔ خردمند
نقشہ ایک اور نے جمایا — پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
تھا افسر خسرواں وہ گلفام — پالا تاج الملوک رکھ نام
پردہ سے نہ دایہ نے نکالا — پُتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
جب نامِ خدا جواں ہوا وہ — مانند نظر رواں ہوا وہ

آتا تھا شکارگاہ سے شاہ — نظارہ کیا پسر کو ناگاہ
مُہرِ لبِ شہ ہوئی خموشی — کی نورِ بصر سے چشم پوشی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی — چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
ہر چند کہ بادشہ نے ٹالا — اُس ماہ کو شہر سے نکالا
گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور — خارج ہوا نورِ دیدۂ کور
آیا کوئی لیکے نسخۂ نور — لایا کوئی جا کے سُرمۂ طور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور — بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے — مختار ہے جس طرح نباہے

۳

تھا اِک کحّال پیرِ دیریں — عیسیٰ کی تھیں اُس نے آنکھیں دیکھیں
وہ مردِ خدا بہت کراہا — سلطاں سے ملا۔ کہا کہ "شاہا!
ہے باغِ بکاؤلی میں اِک گُل — پلکوں سے اُسی پہ مار چنگل
خورشید میں یہ ضیا کرن کی — ہے بھر گیا اُسی چمن کی"
اُس نے تو گلِ ارم بتایا — لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا
شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار — رخصت کیے شہ نے چار ناچار
شاہانہ چلے وہ لیکے ہمراہ — لشکر۔ اسباب۔ خیمے خرگاہ

۴

وہ بادیہ گرد خانہ برباد — یعنی تاج الملوکِ ناشاد
میدان میں خاک اُڑا رہا تھا — دیکھا۔ تو وہ لشکر آ رہا تھا

پوچھا۔ تم لوگ خیل کے خیل — جاتے ہو کدھر کو صورتِ سیل
بولا لشکر کا اِک سپاہی — "جاتی ہے ارم کو فوج شاہی
سلطان زین الملوکِ شہ زور — دیدارِ پسر سے ہو گیا کور
منظورِ علاج روشنی ہے — مطلوب گُلِ بکاؤلی ہے"
گُل کی جو خبر سُنائی اُس کو — گلشن کی ہوا سمائی اُس کو
ہمرہ کِسی لشکری کے ہو کر — قِسمت پہ چلا وہ نیک اختر
اِک چند پھرا کیا وہ انبوہ — صحرا صحرا و کوہ در کوہ
بلبل ہوئے سب ہزار جی سے — گُل کا نہ پتا لگا کسی سے

۵

وہ دامنِ دشتِ شوق کا خار — یعنی تاجُ الملوک دل زار
درویش تھا بندۂ خدا وہ — اللہ کے نام پر چلا وہ
اِک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد — صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا — عنقا تھا نام جانور کا
مُرغانِ ہوا تھے ہوش راہی — نقشِ کفِ پا تھے ریگِ ماہی
وہ دشت کہ جس میں پُر تگ و دو — یا ریگِ رواں تھا یا وہ رہرو
ڈانڈا تھا ارم کے بادشا کا — ایک دیو تھا یا سماں بلا کا
بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک — فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک
حلوے کی پکا کر اِک کڑھائی — شیرینی دیو کو چڑھائی
کہنے لگا یہ کیا مزا ہے دلخواہ! — اے آدمی زاد واہ وا واہ!

چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو　　کیا اس کے عوض میں دوں میں تجھ کو؟
بولا وہ۔ کہ "پہلے قول دیجے　　پھر جو میں کہوں قبول کیجے
گلزار ارم کی ہے مجھے دھن"　　بولا وہ "اے بشر! وہ گلبن
خورشید کے ہم نظر نہیں ہے　　اندیشہ کا واں گذر نہیں ہے
رہ جا! مرا بھائی ایک ہے اور　　شاید کچھ اس سے بن پڑے طور"
حال اس سے کہا۔ کہ قول ہارا　　"ہے پیر یہ نوجوان ہمارا
مشتاق ارم کی سیر کا ہے　　کوشش کرو۔ کام خیر کا ہے"
حمالہ نام دیو نی ایک　　چھوٹی بہن اس کی تھی بڑی نیک
خط اس کو لکھا بایں عبارت　　"اے خواہر مہرباں سلامت!
پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد　　رکھیو اسے جس طرح مری یاد
"انسان ہے چاہے کچھ جو سازش　　مہمان ہے کیجیو نوازش"
"باپ اس کا ہے اندھے پن سے مجہول　　مطلوب بکاؤلی کا ہے پھول"
"دل داغ اس کا برائے گل ہے　　نرگس کے لئے ہوائے گل ہے"
خط لے کے بشر کو لے اڑا دیو　　پہونچا حمالہ پاس بے ریو
بھائی کا جو خط بہن نے پایا　　بھیجے ہوئے کو گلے لگایا
دیوؤں سے کہا کہ "چوہے بنجاؤ　　تا باغ ارم سرنگ پہنچاؤ"
سن حاجت نقب بہر گلگشت　　کترا چوہوں نے دامن دشت
جب مہر تہ زمیں سمایا　　اس نقب کی رہ وہ آدم آیا
کھٹکا جو لگا ہیانوں کا تھا　　دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا

گوشہ میں کوئی لگا نہ ہووے!
خوشہ کوئی تاکتا نہ ہووے!

گو باغ کے پاسباں غضب تھے
خوابیدہ برنگ سبزہ سب تھے

پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل
پہنچا لبِ حوض سے نہ چنگل

پوشاک اُتار اُتر کے لایا
پھولا نہ وہ جامہ میں سمایا

گل لے کے بڑھا ایاغ بر کف
چوری سے چلا چراغ بر کف

گل ہاتھ میں مثلِ دستِ بیضا
اُس نقب کی آستیں سے نکلا

گل لے کے جب آ ملا وہ گلچیں
اُس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

٦

گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا
اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خوابِ آرام
یعنی وہ بکاؤلی گلِ اندام

جاگی مُرغِ سحر کے غل سے
اُٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

مُنہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُرآب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو۔ وہ گل ہوا ہُوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ "ہیں! کدھر گیا گل
جھنجھلائی، کہ کون دے گیا جُل؟"

ہے ہے! مرا پھول لے گیا کون؟
ہے ہے! مجھے خار دے گیا کون؟

ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بُو ہو کے تو گل اُڑا نہیں ہے

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون؟
بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون؟

شبنم کے سوا چُرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا؟

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے!
جس گھر میں ہو گل، چراغ ہو جائے!

آنکھوں سے عزیز گُل مرا تھا — پُتلی وہی چشم حوض کا تھا
گلچیں کا جو ہاے! ہاتھ ٹوٹا — غنچہ کے بھی مُنھ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار! پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کَس لیں نہ تونے سنبل!
او بادِ صبا! ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سُنگھا پتا نہ بتلا!
بُلبُل! تو چہک اگر خبر ہے! — گُل! تو ہی مہک سُنگھا کدھر ہے!
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزہ سے راست مو براندام
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مَل رہا تھا
رنگ اُس کا غرض لگا بدلنے — گُل برگ سے کف لگی وہ ملنے
گُل کا سا لہو بھرا گریباں — سبزہ کا سا تار تار داماں
دِکھلا کے کہا سمن پری کو — "اب چین کہاں! بکاؤلی کو!"
تھی بسکہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اُٹھی۔ ہوا ہوئی وہ
ہر باغ میں ڈھونڈتی پھری وہ — ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ
جس تختہ میں مثلِ باد جاتی — اُس رنگ کے گُل کی بو نہ پاتی
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے — پتا کہیں حکم بن ہلا ہے؟

(نسیم لکھنوی)

از مثنوی میر تقی

محمد تقی نام میر تخلص۔ شرفاے اکبر آباد سے تھے۔ دلی پہنچ کر اُن کی شاعری نے شہرت پائی شعراے ماضی وحال نے اُن کو غزل گوئی کا امام مانا ہے۔ مثنویاں بھی اچھی ہیں۔ مگر قصیدہ پھیکا۔ کلام اُن کا نہایت صاف وشستہ اور پُر اثر ہے آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ سو برس کے ہو کر ۱۲۲۵ھ میں راہی مُلکِ بقا ہوئے درد۔ سودا۔ مصحفی انشا۔ اور جرأت کے ہمعصر تھے۔

ضبط کروں میں کب تک آہ اب
چل رے خامہ! بسم اللہ اب
کہہ ٹک دل کا رازِ نہانی
ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میر اِک خستہ غم تھا
سرتاپا اندوہ و الم تھا
تاب وتوان وشکیب وتحمل
رخصت اُس سے ہوگئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی
بیتابی نے طاقت پائی
خواب وخورش کا نام نہ آیا
ایک گھڑی آرام نہ پایا
سوز سے چھاتی تابہ گویا
اور پلک خونابہ گویا
دل میں تمنا۔ داغ جگر میں
شیون لب پر۔ یاس نظر میں
نالے شب کو اُس کے سُن کر
مر گئے کتنے۔ سر کو دُھن کر
روے وجبیں پہ خراشِ ناخن
داغوں سے خوں کے قامت گلبن
غم نے تو دل میں کیا ہی پھوڑا
بر میں تھا اک پکا پھوڑا
کام رہا ناکامی ہی سے
تسکیں بے آرامی ہی سے
دشنۂ غم سے سینہ کوچا
ناخن سے منہ سارا نوچا

دل آماجگہِ غمناکی　　اور نفس اِک تیرِ خاکی
نے طاقت، نے یارا اُس کو　　ضعفِ دلی نے مارا اُس کو
رنگ اُڑے چہرے کا ہردم　　تھا گویا گلِ آخرِ موسم
رنگِ شکستہ۔ بسکہ فسردہ　　کہنے کو زندہ۔ لیکن مُردہ
دیدۂ ترکے دریا قائل　　ساحلِ خشک لبی کے سائل
ہردم ہو ہر سمت کو جاری　　خونباری سے سیلِ بہاری
خاک بسر آشفتہ سری سے　　شورِ قیامت نوحہ گری سے
وادی پر جب اپنے آوے　　صحرا صحرا خاک اُڑاوے
سر پر اُس کے سنگ ہمیشہ　　جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
آہِ سرد کرے وہ عُریاں　　بید سا کانپے موے پریشاں
پامالی میں مثلِ جادہ　　نقشِ قدم سا خاک اُفتادہ
اُس کے جو پامال ہوے سب　　خارِ بیاباں لال ہوے سب
جس نے دیکھا اُس کو یکدم　　اُس نے کہا یہ بھول کے سب غم

"چندے یہ ناشاد رہے گا
پر مُدّت تک یاد رہے گا"

(میر)

غزلیات

جہاں اُستاد۔ فصیح الملک۔ نواب مرزا خاں۔ داغ دہلوی

۱

جہاں تیرے جلوہ سے معمور نکلا　　پڑی آنکھ جس کوہ پر طور نکلا
یہ سمجھے تھے ہم ایک چرکا ہے دل پر　　دبا کر جو دیکھا۔ تو ناسور نکلا
نہ نکلا کوئی بات کا اپنی پورا　　مگر ایک نکلا۔ تو منصور نکلا
وجود و عدم دونوں گھر پاس نکلے　　نہ یہ دُور نکلا۔ نہ وہ دُور نکلا
سمجھتے تھے ہم داغ گمنام ہوگا　　مگر وہ تو عالم میں مشہور نکلا

۲

وہ زمانہ نظر نہیں آتا　　کچھ ٹھکانا نظر نہیں آتا
دل نے اُس بزم میں بٹھا تو دیا　　اُٹھ کے جانا نظر نہیں آتا
رہیئے مشتاقِ جلوۂ دیدار　　ہم نے مانا نظر نہیں آتا
لے چلو مجھکو رہروانِ عدم　　یاں ٹھکانا نظر نہیں آتا
دلِ پُر آرزو لٹا اے داغ　　وہ خزانہ نظر نہیں آتا

۳

دل میں ہے غم و رنج و الم حرص و ہوا بند　　دُنیا میں مخمّس کا ہوا ہے نہ کُھلا بند
موقوف نہیں دام و قفس پر ہی اسیری　　ہر غم میں گرفتار ہوں۔ ہر فکر میں پابند

اے حضرتِ دل! جائیے میرا بھی خدا ہے	بے آپ کے رہنے کا نہیں کام مرا بند
دم رُکتے ہی سینہ سے نکل پڑتے ہیں آنسو	بارش کی علامت ہے۔ جو ہوتی ہے ہوا بند
کہتے تھے ہم۔ اے داغ! وہ کوچہ ہے خطرناک	چھپ چھپ کے مگر آپ کا جانا نہ ہوا بند
	۴
حضرتِ دل! آپ ہیں جس دھیان میں	مرگئے لاکھوں اسی ارمان میں
گر فرشتہ وش ہوا کوئی۔ تو کیا؟	آدمیت چاہیئے انسان میں
جس نے دل کھویا۔ اُسی کو کچھ ملا	فائدہ دیکھا۔ اِسی نقصان میں
کس نے ملنے کا کیا وعدہ۔ کہ داغ	آج ہو تم اور ہی سامان میں
	۵
خُدا دے۔ تو دے اپنا غم ہر کسی کو	کرے پر نہ مائل کسی پر کسی کو
نہ کرنا صبا! ایسی دیوانی باتیں	یہ کیا؟ کھینچ مارا جو پتھر کسی کو
محبت میں جس جا گئے۔ لُٹ گئے ہم	لیا دل کسی نے۔ دیا سر کسی کو
بہت چھیڑ کر ہم کو پچھتائیے گا	ستاتے نہیں بندہ پرور! کسی کو
	۶
نہیں ہوتی بندہ سے طاعت زیادہ	بس اب خانہ آباد! دولت زیادہ
وہ تشریف لاتے ہی بولے۔ کہ "رخصت!"	نہیں ہم کو ملنے کی فرصت زیادہ
الٰہی! زمانہ کو کیا ہو گیا ہے؟	محبت تو کم ہے۔ عداوت زیادہ
عدم سے سب آتے ہیں یاں چار دن کو	نہیں ہوتی منظور رُخصت زیادہ
مری بندگی سے مرے جرم افزوں	ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ

۷

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی — چمپا کھلی۔ گلاب کھلا۔ موتیا کھلی

ہم تو اسیرِ دام ہیں صیاد! ہم کو کیا؟ — گلشن میں گر بہار بہت خوش نما کھلی

نالوں سے شق ہوا نہ جگر پاسبان کا — دیوارِ قید خانہ مگر بارہا کھلی

رونا نصیب ہیں ہو۔ تو ہنسنا ہو کس طرح؟ — تو شکلِ گل نہ بلبلِ خونیں نوا کھلی

داغ شگفتہ دل کا ذرا دیکھنا اثر — مانندِ غنچہ قبر بھی بعدِ فنا کھلی

۸

سب حسرتوں کا یاس نے کھٹکا مٹا دیا — جن سے خلش تھی دل میں۔ وہ کانٹے نکل گئے

سچ ہے۔ پرائی آگ میں پڑتا نہیں کوئی — ہمراہ کوہِ طور کے موسیٰ نہ جل گئے

اب کیا ہے! اگر کسی سے ملاتے نہیں نظر — لاکھوں ہماری آنکھ سے جلسے نکل گئے

مرتے کے ساتھ کوئی بھی مرتا نہیں کبھی — فرقت میں رفتہ رفتہ سب احباب ٹل گئے

احباب ڈھونڈھتے ہیں۔ پریشان ہیں رفیق — کیا جانئے! آج داغ کدھر کو نکل گئے

۹

غم اٹھانے کے واسطے دم ہے — زندگی ہے اگر۔ تو کیا غم ہے!

کہتے ہو "کچھ کہو"۔ کہوں کیا خاک! — جانتا ہوں۔ مزاج برہم ہے

اب جہاں مہرباں ہوا۔ تو کیا! — مہربانی تری مقدم ہے

سنتے ہیں داغ! کل وہ آئے تھے — بارے اب تو سلوک باہم ہے

۱۰

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی — چڑھی ہے یہ ندی اتر جائے گی

رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں
یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی!
نہ تھی یہ خبر ہم کو۔ اپنی بہار
اِدھر آئے گی اور اُدھر جائے گی!
نہ چھوڑے گی دامن کبھی مُشتِ خاک
صبا ہم سے اُڑ کر کدھر جائے گی
دیا دل۔ تو اے داغ! اندیشہ کیا؟
گذرنی جو ہو گی۔ گذر جائے گی

امیر الشعرا منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی

(۱)

ریاضِ دہر میں پوچھو نہ میری بربادی
برنگِ بُو اِدھر آیا اُدھر روانہ ہُوا
خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا
اِدھر دیا۔ کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہُوا
قدم حضور کے آئے مرے نصیب کُھلے
جوابِ قصرِ سلیماں غریب خانہ ہُوا
جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت
گرا جو آنکھ سے آنسو دُرِ یگانہ ہُوا
جنے مہینوں ہی تنکے غریب بُلبُل نے
مگر نصیب نہ دورِ دو زِ آشیانہ ہُوا
اُٹھائے صدمے پہ صدمے۔ تو آبرو پائی
امیر! ٹوٹ کے دل گوہرِ یگانہ ہُوا

(۲)

وہ تو سُنتا ہی نہیں۔ میں داد خواہی کیا کروں
کس کے آگے جا کے سر پھوڑوں۔ الٰہی! کیا کروں؟
مجھ گدا کو دے۔ نہ تکلیفِ حکومت اے ہوس!
چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں؟
مجھ کو ساحل تک خدا پہونچائے گا اے ناخدا!
اپنی کشتی کی بیاں تجھ سے تباہی کیا کروں؟

وہ مرے اعمالِ روز و شب سے واقف ہے امیر
پیشِ خالق ادّعائے بے گناہی کیا کروں؟

(۳)

انساں عزیزِ خاطرِ اہلِ جہاں نہ ہو	وہ مہرباں نہ ہو۔ تو کوئی مہرباں نہ ہو
پیری میں بھی گیا نہ تغافل ہزار حیف	اتنا بھی کوئی مائلِ خوابِ گراں نہ ہو
آنکھوں سے فائدہ؟ جو نہ دیدار ہو نصیب	حاصل جبیں سے کیا؟ جو ترا آستاں نہ ہو
جانے اگر۔ کہ چاہِ عدم میں گرائے گا	کوئی سوارِ توسنِ عمرِ رواں نہ ہو

(۴)

دل نے جب پوچھا مجھے کیا چاہیے؟	درد بولا اُٹھا تڑپنا چاہیے
حرصِ دُنیا کا بہت قصہ ہے طول	آدمی کو صبر تھوڑا چاہیے
ترکِ لذت بھی نہیں لذت سے کم	کچھ مزہ اس کا بھی چکھا چاہیے
ہے مزاج اُس کا بہت نازک امیرؔ	ضبطِ اظہارِ تمنا چاہیے

(۵)

کی دلِ تسلّی نہ تُند خو کی	سختی پہ بھی نرم گفتگو کی
کی جس پہ نگاہ۔ تجھ کو دیکھا	اب تک تو نظر کہیں نہ چوکی
جز دیر و حرم کہاں میں جاؤں	راہیں تو یہی ہیں جستجو کی
دل ہی نہ رہا اُمید کیسی	جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی
کلفت نہ مٹی امیرؔ دل سے	اشکوں نے ہزار شست و شو کی

۶

موتی کی طرح جو ہو خدا داد	تھوڑی سی بھی آبرو بہت ہے
جاتے ہیں جو صبر و ہوش جائیں	مجھ کو اے درد! تو بہت ہے

مانند کلیم بڑھ نہ اے دل! — یہ درد کی گفتگو بہت ہے
اے نشترِ غم! ہو لاکھ تن خشک — تیرے دم کو لہو بہت ہے
کیا غم ہے امیر! اگر نہیں مال — اس وقت میں آبرو بہت ہے

از مؤلف

(۱)

کام اگر حسبِ مدعا نہ ہوا — تیرا چاہا ہوا۔ بُرا نہ ہوا
سب جتا یا گئے نیازِ قدیم — وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
کیا کھلے؟ جو کبھی نہ تھا پنہاں — کیوں ملے؟ جو کبھی جدا نہ ہوا
سخت فتنہ جہان میں اُٹھتا — کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا
تو نہ ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا — اور کوئی ہوا۔ ہوا۔ نہ ہوا

(۲)

جو بھلے بُرے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا — نہ جزائے خیر پاتا۔ نہ گناہگار ہوتا
میں کبھی کا مر بھی رہتا نہ غمِ فراق سہتا — اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا۔ تمھیں ناگوار ہوتا
ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا — کہ جو میں یہاں نہ ہوتا۔ یہی کاروبار ہوتا

(۳)

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں — ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں
دوستی اور کسی غرض کے لئے! — وہ تجارت ہے۔ دوستی ہی نہیں

جامِ وحدت کی دُرد بھی جس نے
نہیں چکھی۔ وہ متقی ہی نہیں

جس خوشی کو نہ ہو قیامِ دوام
غم سے بد تر ہے۔ وہ خوشی ہی نہیں

(۴)

جہاں تیغِ ہمت عَلم دیکھتے ہیں
محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں

کمالاتِ صانع پہ جن کی نظر ہے
وہ خوبیِ مصنوع کم دیکھتے ہیں

نہیں مبتلا جو تن آسانیوں میں
اُنھیں دمبدم تازہ دم دیکھتے ہیں

اُڑاتے ہیں جو رخشِ ہمت کو سرپٹ
وہ منزل کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں

(۵)

ہے وصف ترا محیطِ اعظم
یاں تاب کسے شناوری کی

دی زندگی اور اُس کا ساماں
کیا شان ہے بندہ پروری کی

کیا آنکھ کو تِل دیا! کہ جس میں
وسعت ہے چرخِ چنبری کی

کی بعد خزاں بہار پیدا
سوکھی ٹہنی ہری بھری کی

کیا بات ہے! اگر کیا ترحّم
ہیہات! جو تونے داوری کی

ہر شکل میں تھا وہی نمودار
ہم نے بھی نگاہ سرسری کی

۶

راہ و رسمِ خط کتابت ہی سہی
گُل نہیں۔ تو گُل کی نکہت ہی سہی

بیدماغی بندہ پرور! اس قدر
آپ کی سب پر حکومت ہی سہی

بسکہ ذکر العیش نصف العیش ہے
یادِ ایامِ فراغت ہی سہی

حُسنِ صورت کا نہ تھا اصلا فریب
کلکِ صنعت گر کی صنعت ہی سہی

کچھ نہ کرنا بھی مگر اک کام ہے
گر نہیں صحبت۔ تو عزلت ہی سہی

۷

ممکن ہے کہ ٹل جائے جبل اپنے مقر سے
لیکن کبھی تبدیل جبلت نہیں ہوتی

ہو جان کی جوکھوں بھی اگر راہِ طلب میں
پست اِس سے اولوالعزم کی ہمّت نہیں ہوتی

خلوت میں بھی لاتے نہیں عاقل اُسے مُنھ پر
جو بات کہ شائستہ جلوت نہیں ہوتی

ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت
اصلاح پذیر اس لئے عادت نہیں ہوتی

پیتے کی طرح جو کوئی محکوم ہوا ہو
اُس شخص کی دُنیا میں کبھی پت نہیں ہوتی

ڈھاتی ہے قیامت بھی خونخوار جہاں میں
کچھ غم نہیں ہوتا۔ جو محبت نہیں ہوتی

(۸)

تو جان بیچکر بھی۔ جو فضل و ہنر ملے
جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے

جب چشم آز چھوٹ گئی سب خلش مٹی
اب سنگریزہ ہاتھ لگے۔ یا گہر ملے

ممکن نہیں بغیر قناعت فراغ بال
ہر چند تودہ تودہ تجھے سیم و زر ملے

جن کو نہیں ہے درد و دوا میں کچھ امتیاز
قسمت سے اِن گنوں کے ہمیں چارہ گر ملے

۹

بغیر توکل نہیں چارا مجھے
اپنے ہی دم کا ہے سہارا مجھے

حرص و طمع نے تو ڈبویا ہی تھا
صبر و قناعت نے اُبھارا مجھے

جو وہ کرے اُس کو سزاوار ہے
چون و چرا کا نہیں یارا مجھے

فرصتِ اوقات ہے بس مغتنم
پھر نہیں ملنے کی دوبارا مجھے

آہ! نہیں رخصتِ افشائے راز
قصّہ تو معلوم ہے سارا مجھے

سراج الدین محمد بہادر شاہ - ظفر

سراج الدین محمد نام تھا ۔ بہادر شاہ لقب ۔ ظفر تخلص ۔ آخری جانشین شاہان مغلیہ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے ۔ ان کا کلام نہایت سادہ وسلیس اور روزمرہ اُردو کا عمدہ نمونہ ہے ۔

(۱)

کسی نے اُس کو سمجھایا تو ہوتا / کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا
نہ بھیجا تونے لکھ کر ایک پرچہ / ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا
نہ بولا ۔ ہم نے کھڑکایا بہت در / ذرا درباں کو کھڑکایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا ۔ تونے تقدیر! / وہاں تک مجکو پہنچایا تو ہوتا
دل اُس کی زلف میں اُلجھا ہے کب سے / ظفر! اک روز سلجھایا تو ہوتا

(۲)

ہر بات میں تو ایک بھی ہے لاکھ پہ بھاری / گر بات کو اپنی نہ کرے طول سے ہلکا
ہے جامۂ تکلف کا پسندیدۂ احمق / ہوگا نہ گدھا یہ کبھی اِس جھول سے ہلکا
جز تارکِ دُنیا ہو ہوس سے نہ سبکدوش / یہ بوجھ نہ دنیا کے ہو مشغول سے ہلکا
صرفہ نہیں کاغذ کا ۔ مگر بھیجتے ہیں وہ / خط ڈاک میں اندیشۂ محصول سے ہلکا
دنیا میں ظفر! جو ہے گرانبارِ جہالت / کب ہوتا ہے وہ مردم معقول سے ہلکا

(۳)

آکے پروانہ ہی کیا اس بزم میں جل بُھن گیا / شمع بھی یاں رو گئی شعلہ بھی یاں سر دُھن گیا
جائیے اُس در پہ اور دھونی رما کر بیٹھیے / جو گیا دل سوختہ واں باندھ کر یہ دُھن گیا
نام جس کا رہ گیا کچھ اُس کا گُن باقی رہا / ورنہ جو یاں سے گیا ساتھ اُس کے اُس کا گن گیا

ہیں صبا! وہ طائر بے طاقت اِس گلشن بیچ ں
ایک پر جس کا نہ اُڑ کر تا سرِ گلبن گیا

واسطے بے مغز کے کیا خاک ہو نشو و نما!
سبز ہو سکتا نہیں وہ۔ جو کہ دانہ گُھن گیا

جاگ اُٹھا خواب عدم سے یک بیک سارا جہاں
کان میں جس دم ظفر! خالق کا امرِ کُن گیا

(۴)

غم خانۂ دُنیا میں ہے جینے کا مزا ہیچ!
اِس بے مزگی میں کوئی جیتا ہے تو کیا ہیچ!

کیا کیا محل و قصر بناتے ہیں تونگر
از بہرِ نشاں۔ لیک نشاں بعدِ فنا ہیچ!

ایمان کو نہ دے ہاتھ سے غافل! کہ بس مرگ
آنے کا نہیں کام ترے اِس کے سوا ہیچ!

(۵)

چاہتے ہیں کب نشاں اپنا مثالِ نقشِ پا!
جو کہ مٹجانے کو بیٹھے ہیں فنا کی راہ پر

دل سے ہو کیونکر طریقِ آشنائی میں خلاف
آشنا وہ ہے۔ کہ جو ہو آشنا کی راہ پر

ہے بہ صراط المستقیم اُس کے لئے جس نے ظفر!
اِستقامت کی ہے تسلیم و رضا کی راہ پر

(۶)

اِتنا نہ اپنے جامہ سے باہر نکل کے چل
دُنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

کم ظرف! پُر غرور! ذرا اپنا ظرف دیکھ
مانندِ جوشِ خُم نہ زیادہ اُبل کے چل

فرصت ہے اِک صدا کی یہاں سوزِ دل کے ساتھ
اِس پر سپند وار نہ اِتنا اُچھل کے چل

یہ غول وش ہیں۔ اِن کو سمجھ تو نہ رہنما
سایہ سے بچکے اہلِ فریب و دغل کے چل

اِنسان کل کا پُتلا بنایا ہے اُس نے آپ ق
اور آپ ہی وہ کہتا ہے پُتلے کو کل کے چل

پھر آنکھیں بھی تو دی ہیں۔ کہ رکھ دیکھ کر قدم
کہتا ہے کون تجکو! نہ چل۔ چل! سنبھل کے چل

جو اِمتحانِ طبع کرے اپنا۔ اے ظفر
تو کہدو اُس کو طور پہ تو اِس غزل کے چل

(۷)

نہیں تم کو لازم بُرائی کی باتیں
بھلوں کو ہیں زیبا بھلائی کی باتیں

غضب ہے! کہ دل میں تو رکھو کدورت
کرو مُنھ پہ ہم سے صفائی کی باتیں

اگر سیدھے ہوتے ترے بختِ واژوں
تو کیوں کرتے وہ کج ادائی کی باتیں

قفس میں ہے کیا فائدہ شور وغل سے
اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں

ظفر! کیا زمانہ بُرا آگیا ہے
جہاں دیکھو ہیں واں بُرائی کی باتیں

(۸)

گرد جواے شہسوار! آئی نظر اُڑتی ہوئی
تیرے آنے کی ہمیں پہونچی خبر اُڑتی ہوئی

دل جلوں کی ہوتی قسمت میں نہ بربادی تو کیوں
پھرتی پروانہ کی خاکستر سحر اُڑتی ہوئی

وہ شکار انداز لے جب ہاتھ میں اپنے تفنگ
برق ٹھہر جائے رنجک دیکھ کر اُڑتی ہوئی

بے ثباتی کیا کہوں ہستی کی؟ دیکھی ہی نہیں
سرخیٔ رنگِ حنا جلد اس قدر اُڑتی ہوئی

ہے جو کچھ رونق صفائی میں ہے دل کی درنہاں
خاک ہی دیکھی کدورت میں ظفر! اُڑتی ہوئی

(۹)

کیا کیا آکر تری محفل میں ہم نے شمع ساں!
ہاں! مگر جلکر بجُزوں کی جان کو ہم رو گئے

حضرتِ دل تو گئے۔ پر کر گئے اور اک ستم
ساتھ اپنے مجکو بھی دونوں جہاں سے کھو گئے

شوق اپنا تم سے دونا ہی محبت میں رہا
جب وہاں سے ایک خط آیا یہاں سے دو گئے

اے ظفر! جاؤ۔ دلِ دیوانہ کو ڈھونڈھو کہیں
ہے خدا جانے کہاں؟ مُدت ہوئی اُس کو گئے

ملکِ الشعرا شیخ اِبراہیم ذوق

کلام نہایت عام پسند۔ محاورات و ضرب الامثال خوب باندھتے ہیں مفصل حال دیکھو صفحہ ۲، حصۂ نثر

۱

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا   اگر پایا۔ تو کھوج اپنا نہ پایا
جس اِنساں کو سگِ دُنیا نہ پایا   فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا
مُقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے   تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا
سُراغِ عمرِ رفتہ ہو۔ تو کیونکر؟   کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا
رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا   غُبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا
رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم   کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
اِحاطے سے فلک کے ہم تو کب کے   نکل جاتے مگر رستا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا   کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
کہے کیا ہائے زخمِ دِل ہمارا!   دہن پایا۔ لبِ گویا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم   غرض۔ خالی دلِ شیدا نہ پایا
نظیر اُس کا کہاں عالم میں اے ذوق!   کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

۲

نالہ اِس زور سے کیوں میرا دُہائی دیتا   اے فلک! اگر تجھے اُونچا نہ سُنائی دیتا
دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا   آسماں آنکھ کے تِل میں ہے دِکھائی دیتا
کون گھر آئنہ کے جاتا؟ اگر وہ گھر میں   خاکساری سے نہ جاروبِ صفائی دیتا
منھ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خُدا کے بندے   گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ اگر دیکھنا ہے ذوقؔ! کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

۳

بے نصیب اُس کے ہیں گر دیدار سے
بس دو آنکھوں کو نظر کے تار سے

اُٹھ چکا وہ ناتواں - جو رہ گیا
دب کے تیرے سایۂ دیوار سے

اپنے دامن کو بچا کر جائیو
برق! میرے وادیِ پُرخار سے

ناکسوں سے کیا رُکیں وارستگاں!
اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے

۴

وہ خلق سے پیش آتے ہیں۔ جو فیض رساں ہیں
ہے شاخ ثمردار میں گُل پہلے ثمر سے

فریادِ ستم کش سے ہے وہ شمشیر کشیدہ
جس کا نہ رُکے وار فلک کی بھی سپر سے

اشکوں میں بہے جاتے ہیں ہم سوے دیار
مقصودِ رہِ کعبہ ہے دریا کے سفر سے

اے ذوقؔ! کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

۵

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبّت والے

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پانوں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

نہیں جز شمع محا در مرے بالینِ مزار
نہیں جُز کثرتِ پروانہ زیارت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ۔ نہ کرم کی خواہش
دیکھ لو! ہم بھی ہیں۔ کیا صبر و قناعت والے!

کیا تماشا ہے! کہ مثلِ مہِ نو اپنا فروغ
جانتے اپنی حقارت کو ہیں شُہرت والے

کبھی افسوس سے ہے آتا۔ کبھی رونا آتا
دلِ بیمار کے ہیں وہ ہی عیادت والے

نازہے گُل کو نزاکت پہ چمن میں۔اے ذوق! — اُس نے دیکھے ہی نہیں نازو نزاکت والے!

۶

نہیں ثبات بلندیِ عزّ و شاں کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی۔کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے
جو پاس مہر و محبت کہیں یہاں بکتا — تو مول لیتے ہم اِک اپنے مہرباں کے لئے
اگر اُمید نہ ہمسایہ ہو۔تو خانۂ یاس — بہشت ہے ہمیں آرامِ جاوداں کے لئے
وبالِ دوش ہے اِس ناتواں کو سر لیکن — لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے
بنایا آدمی کو ذوق! ایک جزوِ ضعیف — اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

۷

ایسا نہ ہو کہ آتے ہی آتے جوابِ خط — قاصد! جواب زندگیِ مستعار دے
اے شمع! تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اِسے رو کر گزار دے
بے فیض گر ہے چشمۂ آبِ بقا تو کیا! — مانگو۔تو ایک قطرہ نہ آئینہ وار دے
پشّہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی — جب قصدِ خوں کو آئے۔تو پہلے پکار دے
اس جبر پر تو ذوق! یہ انساں کا حال ہے — کیا جانئے کیا کرے! جو خُدا اختیار دے

۸

لائی حیات۔آئے۔قضا لے چلی۔چلے — اپنی خوشی نہ آئے۔نہ اپنی خوشی چلے
ہمسا بھی اِس بساط پہ کم ہوگا بد قمار — جو چال ہم چلے۔وہ نہایت بُری چلے
بہتر تو ہے یہی۔کہ نہ دُنیا سے دل لگے — پر کیا کریں! جو کام نہ بے دل لگی چلے
ہو عمرِ خضر بھی۔تو ہو معلوم وقتِ مرگ — ہم کیا رہے یہاں! ابھی آئے ابھی چلے

حکیم مومن خاں۔ مومن

مومن خاں نام۔ مومن تخلص۔ وطن دلّی۔ طبابت پیشہ آبائی۔ سنہ ۱۲۱۵ ہجری میں پیدا ہوئے سنہ ۱۲۶۸ ہجری میں رحلت کی۔ نہایت ذکی و ذہین آدمی تھے۔ اُن کی روش خاص معاملہ بندی ہے۔ کہیں میر و درد کی سی سادہ بیانی۔ کہیں باریکی۔ ذوق و غالب کے ہمعصر تھے۔

۱

وعدۂ وصلت سے ہو دل شاد کیا! — تم سے دشمن کی "مبارکباد" کیا!
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا!
ہیں اسیر اُس کے۔ جو ہے اپنا اسیر — ہم نہ سمجھے صید کیا! صیّاد کیا!
نالہ اِک دم میں اُڑا ڈالے دھوئیں — چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا!
جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو — بے وفا! پھر حاصل بیداد کیا؟
کیا کروں اللہ! سب ہیں بے اثر — ولولہ کیا! نالہ کیا! فریاد کیا!
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا!
بتکدہ جنّت ہے۔ چلیے بے ہراس — لب پہ "مومن" ہرچہ بادا باد" کیا!

۲

کیا رم نہ کرو گے۔ اگر ابرام نہ ہو گا — الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہو گا
ہاں جوشِ تپش! چھیڑ چلی جائے کہ پرتو — بھر جائیں گے۔ فرسودہ اگر دام نہ ہو گا
ناکامیِ امید پہ صبر آئے۔ تو کیا آئے — ہر بات میں کہتے ہو۔ کہ یہ کام نہ ہو گا

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن
کیا شعر کہیں گے۔ اگر الہام نہ ہو گا

۳

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
اُس نے کیا جانے کیا کیا لیکر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا
آہ! طولِ امل ہے روز افزوں — گرچہ اِک مُدّعا نہیں ہوتا
نارسائی سے دم رُکے۔ تو رُکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرضِ مومنِ مُضطر — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

۴

قابو میں نہیں ہے دِل کم حوصلہ اپنا — اِس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا
لبیکِ حرم ہم ہیں۔ نہ ناقوسِ کلیسا — پھر شیخ و برہمن میں ہے کیوں غلغلہ اپنا؟
تھے دشت میں ہمراہ مرے آبلۂ چند — سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا
اِس حال کو پہونچے ترے قصّہ سے کہ اب ہم — راضی ہیں۔ گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا
انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم — تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

۵

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب! — کہیں سایہ مرا پڑا۔ صاحب! —
ستم۔ آزار۔ ظلم۔ جور۔ جفا — جو کیا۔ سو بھلا کیا۔ صاحب! —
کیوں اُلجھتے ہو جنبشِ لب سے — خیر ہے! میں نے کیا کہا؟ صاحب —
کیوں لگے دینے خطِ آزادی — کچھ گنہ بھی غلام کا؟ صاحب —

نامِ عشقِ بتاں نہ لو۔ مومنؔ　　کیجئے بس خدا خدا صاحب!

۶

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم　　پر کیا کریں! کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

مجھ سے نہ بولو تم۔ اِسے کیا کہتے ہیں بھلا!　　انصاف کیجے۔ پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

صاحب نے اِس غلام کو آزاد کر دیا؟　　لو بندگی! کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا گل کھِلے گا! دیکھئے ہے فصلِ گل تو دُور　　اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں　　مومنؔ نہ ہوں۔ جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

۷

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھّے　　کیا علَم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اِک حرفِ غلط　　لیک اُٹھّے بھی۔ تو اِک نقش بٹھا کے اُٹھے

اُف ری گرمیِ محبت! کہ ترے سوختہ جاں　　جس جگہ بیٹھ گئے۔ آگ لگا کے اُٹھے

میں دکھاتا تجھیں تاثیر۔ مگر ہاتھ مرے　　ضعف کے ہاتھ سے کب وقتِ دعا کے اُٹھے

شعرِ مومنؔ کے پڑھے بیٹھ کے اُس کے آگے　　خوب احوالِ دِلِ زار سنا کے اُٹھے

۸

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　تلافی کی بھی ظالم نے۔ تو کیا کی

فلک کے ہاتھ سے میں جا چھپوں گر　　خبر لادے کوئی تحت الثریٰ کی

جفا سے تھک گئے۔ تو بھی نہ پوچھا　　کہ تو نے کس توقّع پر وفا کی؟

کہا اُس شوخ سے "مرتا ہے مومنؔ"
کہا "میں کیا کروں! مرضی خُدا کی"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

مصطفیٰ خاں نام شیفتہ تخلص۔ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے جاگیردار اور عمائد دہلی سے تھے۔ ان کی ذات ستودہ صفات امارت۔ فقر اور علم وفضل کی جامع تھی۔ ریختہ میں حکیم مومن خاں مومن سے مشورہ کرتے تھے۔ کلام نہایت متین وسنجیدہ۔ فارسیت کا رنگ غالب ۱۲۸۶ھ ہجری میں رحلت فرمائی ؞

۱

اے جانِ بیقرار ذرا صبر چاہیئے — بے شک اِدھر بھی آئیگا جھونکا نسیم کا
جس کی سرشت صاف نہ ہو آدمی نہیں — نیرنگ وعشوہ کام ہے دیوِ رجیم کا
طاعت اگر نہیں۔ تو نہ ہو۔ یاس کس لئے! — وابستہ سبب ہے کرم کب کریم کا
جس وقت تیرے لطف کے دریا کو جوش آئے — فوّارۂ جناں ہو زبانہ جحیم کا
اے شیفتہ! عذاب جہنم سے کیا مجھے — میں اُمتی ہوں نار وجناں کے قسیم کا

۲

دلِ زار کا ماجرا کیا کہوں! — فسانہ ہے مشہور سیماب کا
کہاں بیخودہ نایاب! پایا جسے — غلط شوق ہے جنس نایاب کا
نہ کیجو غل۔ اے خوشنوایانِ صبح — یہ ہے وقت اُن کے شکر خواب کا
محبت نہ ہرگز جتائی گئی — رہا ذکر کل اور ہر باب کا
وہاں تیرہ روزوں کی پروا کسے — جہاں شغل ہو سیر مہتاب کا
میں بیجرم رہتا ہوں خائف کہ واں — جفا میں نہیں دخل اسباب کا
نہ کرنا خطا پر نظر شیفتہ — کہ اِغماض شیوہ ہے احباب کا

۳

اہل طریق کی بھی روش سب سے ہے الگ	جتنا زیادہ شغل۔ زیادہ فراغ بال
ہنگام عہد کام میں لائے وہ ایسے لفظ	جن کو ہے معنی متعدد پر اشتمال
یہ بات تو غلط ہے۔ کہ دیوانِ شیفتہ	ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ! اِس میں کم	ہاں! ذکر خد و خال۔ اگر ہے۔ تو خال خال

۴

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں؟	گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اُس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ	آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں
معنی کی فکر چاہیئے۔ صورت سے کیا حصول!	کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سُراب میں
ذات وصفات میں بھی یہی ربط جانیے	جو آفتاب و روشنئ آفتاب میں
قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو	دیکھو وہ آنکھ سے۔ جو نہ دیکھا ہو خواب میں
مرنے کے بعد بھی کہیں شاید پتا لگے	کھویا ہے ہم نے آپ کو عہدِ شباب میں
وہ قطرہ ہوں۔ کہ موجۂ دریا میں گم ہوا	وہ سایہ ہوں۔ کہ محو ہوا آفتاب میں
اُس صوتِ جاں نواز کا ثانی نہیں بنا	کیا ڈھونڈھتے ہو! بربط و عود و رباب میں
اے آفتِ زمانہ ترے دَور میں شکیب	بلبل کو باغ میں ہے۔ نہ ماہی کو آب میں
بیباک شیوہ۔ شوخ طبیعت۔ زباں دراز	ملزم ہوا ہے۔ پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو۔ مگر حضور!	اِس وقت اِتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

۵

جو کہ ہوا محوِ تجلیِ ذات	خاکِ در اُس شخص کی اکسیر ہے

کھیل ہے کچھ یہ؟ کہ دِکھا دوں تمھیں
فرض کیا۔ آہ میں تاثیر ہے

خط کے نہ لکھنے کا لکھوں کیا گلہ؟
خامہ! مدد کر دمِ تحریر ہے

کیا کہوں احباب کی آہن دلی
پانوٗں میں فولاد کی زنجیر ہے

ہم سے وہ ناحق جو خفا ہوگئے
شیفتہ! کچھ اپنی ہی تقصیر ہے

۶

ستمگر کہے سے بُرا مانتا کیوں!
رستم کو اگر وہ بھلا جانتا ہے

جو بیگانہ جانے تجھے خلق کیا غم!
اگر آشنا آشنا جانتا ہے

اُسے کنجِ خلوت کی کیا ہے ضرورت!
جو محفل کو خلوت سرا جانتا ہے

بہر صورت آئینہ بھی مغتنم ہے
کچھ آئینِ اہلِ صفا جانتا ہے

ہمیں شیفتہ کی نصیحت سے حاصل!
کہ وہ آپ ہم سے سوا جانتا ہے

۷

ابھی کہوں۔ تو کریں لوگ شرمسار مجھے
کہ کس کے وعدہ پہ اتنا ہے اِنتظار مجھے

یہی گمان یہی رشک ہے اگر۔ تو کبھی
نہ کوئی دوست ملیگا نہ کوئی یار مجھے

قفس میں کرتی ہے تحریکِ بال جُنبانی
نوائے دلکشِ مُرغانِ شاخسار مجھے

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

رہے سرائرِ مکتومہ دل ہی میں۔ افسوس!
جہان میں نہ مِلا کوئی رازدار مجھے

جفا کو ترک کرو تم۔ وفا کو میں چھوڑ دوں
کچھ اشتہار تمھیں ہو کچھ اِشتہار مجھے

جو شورشیں نہ مچاتا۔ اسیر کیوں ہوتا؟
خراب تو نے کیا۔ جلوۂ بہار مجھے

بڑے فساد اُٹھیں شیفتہ! خدا نہ کرے!
کہ اُن کی بزم میں ہو دخلِ اختیار مجھے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

اُن کے کلام میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال بیشتر مگر الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چستی بے مثل معانی کثیر کو الفاظِ قلیل میں بیان کرنا اِن کا خاصہ ہے۔ ابتدائے عُمر میں دس برس تک بیدل و اسیر کے طرز پر خیالی مضامین لکھا کیے۔ جب تمیز آئی۔ اُس دیوان کو چاک کر ڈالا۔ دیوانِ حال میں کچھ نمونہ ابتدائی کلام کا موجود ہے۔

۱

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا؟ — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا؟
بے نیازی حد سے گذری۔ بندہ پرور کب تلک — ہم کہینگے عرضِ حال اور آپ فرمائینگے کیا؟
حضرتِ ناصح گر آئیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجکو یہ تو سمجھا دو۔ کہ سمجھائینگے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوے جاتا ہوں میں — عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں۔ زنجیر سے بھاگینگے کیوں؟ — ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا؟
ہے اب اِس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسد — ہم نے یہ مانا۔ کہ دلّی میں رہے۔ کھائینگے کیا؟

۲

یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے۔ یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم۔ تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو۔ وہ اگر شرار ہوتا
کہوں کس سے میں۔ کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے — مجھے کیا بُرا تھا مرنا۔ اگر ایک بار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا۔ کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی۔ تو کہیں دو چار ہوتا
یہ مسائلِ تصوّف! یہ ترا بیان غالب! — تجھے ہم ولی سمجھتے۔ جو نہ بادہ خوار ہوتا

۳

ہوئی تاخیر۔ تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا؟ — آپ آتے تھے۔ مگر کوئی عناں گیر بھی تھا؟

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اُس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو۔ تو پتا بتلادوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؟

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے۔ تو کیا! — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں۔ رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوانمیر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا۔ نہ سہی! — آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؟

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب! — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۴

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — "جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر"

کام اُس سے آپڑا ہے۔ کہ جس کا جہان میں — لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے۔ وگرنہ ہم — سر جائے یا رہے۔ نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بت کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ۔ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض — ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

۵

کب سے ہوں۔کیا بتاؤں! جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

قاصد کے آتے آتے خط اِک اَور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں۔جو وہ لکھیں گے جواب میں

ہیں آج کیوں ذلیل۔کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

رَو میں ہے رخشِ عُمر۔کہاں (دیکھیے) تھمے!
نے ہاتھ باگ پر ہے۔ نہ پا ہے رکاب میں

اِتنا ہی مجکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا۔کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں۔پھر مُشاہدہ ہے کس حساب میں!

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

غالب! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

۶

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے! وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو۔جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے۔اے فلکِ ناانصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۲

کوئی دن گر زندگانی اَور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اَور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اَور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اَور ہے

دے کے خط منھ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اَور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اَور ہے

خواجہ حیدر علی - آتش

خواجہ حیدر علی نام - آتش تخلص - اِن کے والد دلّی سے لکھنؤ آئے - خواجہ کو ابتدائے عمر سے شاعری کا چسکا لگا - شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے - غزل گوئی میں شیخ ناسخ سے مقابلہ رہا - ان کے کلام میں لطف محاورات اور گرمی و تاثیر بہ نسبت شیخ ناسخ کے زیادہ ہے ۔

۱

حسنِ پری اِک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہُشیار وہی ہے - کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

وہ شوخ نہاں گنج کی مانند ہے اِس میں
معمورۂ عالم جو ہے - ویرانہ ہے اُس کا

جو چشم - کہ حیراں ہوئی - آئینہ ہے اُس کی
جو سینہ - کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا

دل قصرِ شہنشہ ہے - وہ شوخ اُس میں شہنشاہ
عرصہ یہ دو عالم کا جِلَو خانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اُس کی - جو بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر - وہ یارانہ ہے اُس کا

یوسف نہیں - جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا

آوارگیِ نکہتِ گل ہے یہ اِشارہ
جامہ سے وہ باہر ہے - جو دیوانہ ہے اُس کا

یہ حال ہوا اُس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے - بیگانہ ہے اُس کا

شکرانۂ ساقیِ اجل کرتا ہے آتش
لبریزئ شوق سے پیمانہ ہے اس کا

۲

برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں
تو اس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا

ہزاروں حسرتیں جائینگی میرے ساتھ دنیا سے
شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں
غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

ہوا ہرگز نہ خطِ شوق کا ساماں درست آتش!
سیاہی ہوگئی نایاب۔ اگر ہم نے قلم پایا

۳

نہ بوریا بھی میسر ہوا بچھانے کو
ہمیشہ خواب ہی دیکھا کیے چھپر کھٹ کا

مطیعِ نفس نہ اللہ نے کیا مجکو
نہ میں نے پیروی غول کی۔ نہ میں بھٹکا

نہ پھول بیٹھ کے بالائے سرو۔ اے قمری!
چڑھے جو بانس کے اوپر یہ کام ہے نٹ کا

عجیب بھول بھلیاں ہے غفلتِ ہستی
جسے کہ راہ ہوئی اس سے خوب ہی بھٹکا

عجب نہیں ہے۔ جو سودا ہو شعر گوئی سے
خراب کرتا ہے آتش! زبان کا چٹکا

۴

اے چرخ بے مروت اہل بے تنک مزاجی!
خوش تیرے گھر میں دو دن اک میہماں نہ ٹھہرا

برباد کر نہ ناحق اے بادِ صرصر! اس کو
بلبل کا آشیانہ برگِ خزاں نہ ٹھہرا

عزلت گزینی کا جو میں نے کیا ارادہ
کنجِ لحد سے بہتر کوئی مکاں نہ ٹھہرا

پھونک آشیاں ہمارا اے برقِ آتشِ گل!
رہنے کے قابل اپنے یہ بوستاں نہ ٹھہرا

میری ہی خاک پر کی منہ زوری اس نے آتش
پھرو سمندِ قاتل ورنہ کہاں نہ ٹھہرا

۵

مسافر کی طرح رہ خانہ بر دوش
نہیں جائے اقامت دارِ فانی

یقیں ہے دیدۂ باریک بیں کو
کرے عینک طلب یہ ناتوانی

یہ مشتِ خاک ہو مقبولِ درگاہ
صبا کی چاہتا ہوں مہربانی

سفیدی مو کی ہو کافور ہر چند
کہیں مٹتا ہے یہ داغ جوانی!

نہ خوش ہو فربہیِ تن سے غافل!
سُبک کرتی ہے مُردہ کو گرانی

موے جو پیشتر مرنے سے۔ وہ لوگ
کفن سمجھے قبا سے زندگانی

ہوا کوئی نہ حالِ دل سے آگاہ
رہی مشتاقِ گوش اپنی کہانی

خُدا کے حکم سے ہے قوّتِ نطق
کلام اپنا ہے ہاتف کی زبانی

مرا دیواں ہے۔ اے آتش! خزانہ
ہر اک بیت اس میں ہے گنجِ معانی

۶

آنکھوں کو کھول۔ اگر تو دیدار کا ہے بھوکا
چودہ طبق سے باہر نعمت نہیں ہے کوئی

یہ کیا سمجھ کے کڑوے ہوتے ہیں آپ ہم سے!
پی جائیے گا کس کو! شربت نہیں ہے کوئی

میں نے کہا کبھی تو تشریف لاؤ! بولے
"معذور رکھیے۔ وقتِ فرصت نہیں ہے کوئی"

دل لیکے جان کے بھی سائل جو ہو۔ تو حاضر
حاضر جو کچھ ہے۔ اس میں حجّت نہیں ہے کوئی

ہم شاعروں کا حلقہ حلقہ ہے عارفوں کا
ناآشنائے معنیٔ صورت نہیں ہے کوئی

ہژدہ ہزار عالم دم بھر رہا ہے تیرا
تجکو نہ چاہے۔ ایسی خلقت نہیں ہے کوئی

نازاں نہ حُسن پہ ہو۔ مہماں ہے کوئی دم کا
بے اعتبار ایسی دولت نہیں ہے کوئی

یوں بد کہا کرو تم۔ یوں مال کچھ نہ سمجھو
ہمسا بھی خیر خواہ دولت نہیں ہے کوئی!

ماد شما - کہہ دمہ کرتا ہے ذکر تیرا	اس داستاں سے خالی صحبت نہیں ہے کوئی

۷

منزل ہی دور ہے جو یہ پہنچی نہیں ہنوز	دم لینے والی راہ میں عمرِ رواں نہ تھی
دکھلائے سیر آنکھوں کو بامِ مراد کی	ایسی کوئی کمند - کوئی نردباں نہ تھی
نافہمی کی دلیل ہے یہ سجدہ سے ابا	ابلیس کو حقیقتِ آدم عیاں نہ تھی
افسوس کیا جوانیِ رفتہ کا کیجئے!	وہ کونسی بہار تھی! جس کو خزاں نہ تھی
نالوں سے ایک دن نہ کئے گرم گوشِ یار	آتش! مگر تمھارے دہن میں زباں نہ تھی

شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش نام - ناسخ تخلص - لکھنؤ کے مشاہیر شعرا سے ہیں اور اپنے وقت کے اُستاد - میر تقی - مصحفی - انشا - جرأت کا اخیر زمانہ دیکھا تھا - خواجہ آتش کے ہمعصر تھے کلام ان کا اصول فن کے مطابق نہایت سنجا، تلا - تشبیہ و تمثیل سے معمور - مگر دلآویزی و تاثیر کم -

۱

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا	جس سینہ میں کینہ ہو - وہ سینہ نہیں اچھا
آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے	"مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا"
ہو سیر جو منظور (دلا!) بحرِ جہاں کی	جز کشتیِ درویش سفینہ نہیں اچھا

۲

دشمنِ سر ہے تری گردن کشی مانندِ شمع	افسرِ زر شوق سے رکھ، پر نہ اتنا سر اُٹھا
زندگی میں صرف کرتا ہو سکندر سی حصول	مثلِ قاروں خاک میں جا کر نہ بارِ زر اُٹھا
چاہیئے تعمیرِ دل، جو ساتھ اُٹھا لیجائے گا	یوں خرابی کے لئے دیوار اُٹھا، یا در اُٹھا

بات جن نازک مزاجوں سے نہ اُٹھتی تھی کبھی بوجھ اُن سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اُٹھا؟
کیا سخن سنجی سے حاصل، جب سخنداں ہی نہیں زانوے فکرت سے اے ناسنج! تو اپنا سر اُٹھا

(۳)

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر
ہوتی ہے غربت میں ثروت یہ بڑی ایذا کے بعد رنج اُٹھائے کس قدر یوسف نے کنعاں چھوڑ کر
اعتماد اصلا نہیں۔ گر ہے جہاں زیرِ نگیں اُٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر
آج تو پوشاک پر مرتا ہے تو۔ کل دیکھنا! جائیگا ناسنج تیری لاش عُریاں چھوڑ کر

(۴)

خوش قدوں کی خاک یہ اُٹھتی ہے ہر دم سرو قد گردباد اے اہلِ غفلت اِس بیاباں میں نہیں
آج نقاشی کی چھت لگوا نہیں مانع کوئی کل بجز خفاش کوئی سقفِ ایواں میں نہیں
دوست دشمن سب کے سب ہیں رفتنی مثلِ نسیم گل تو کیا! کانٹا بھی اِک دن اِس گلستاں میں نہیں
دُم دبا جاتے تھے جن کے سامنے شیرِ ژیاں غیر روباہ و شغال اب اُن کے ایواں میں نہیں
بے وطن ہو کر زمانے میں ہوے نالاں بشر آشنا نالوں سے ہر گز نَے نیستاں میں نہیں

(۵)

دور وزا ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں وہ کونسا چمن ہے؟ کہ جس کو خزاں نہیں
حاصل تجھے بصارتِ یعقوبؑ ہو اگر یوسف بغیر کوئی یہاں کارواں نہیں
منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں
پژمردہ ایک ہے۔ تو شگفتہ ہے دوسرا باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

(۶)

بیاں کیا ہو سکے عُمرِ رواں کی مجھ سے چالاکی
کہ اِس توسن سے لگّا ہے نہ ترکی کو نہ تازی کو

اکیلا دل مرا فوجِ تمنّا کے مُقابل ہے
الٰہی کیجیو تو فتحیاب اِس مردِ غازی کو

ثمر پختہ جو ہے (اے خام طبعو!) باغِ عالم میں
نہ کیونکر خاکساری سے وہ بدلے سرفرازی کو

(۷)

"پا شکستہ جو ہے۔ کرتا ہے جہاں میں سلطنت"
یہ صدا آتی ہے ہر دم تربتِ تیمور سے

مُنعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور سے

بانٹ لے کوئی کسی کا درد یہ ممکن نہیں
بارِ غمِ دُنیا میں اُٹھواتے نہیں مزدور سے

دیکھنا (اے اہلِ عبرت!) انتقامِ آسماں
بنتے ہیں جامِ گدا خاکِ سرِ فغفور سے

شیخ قلندر بخش جُرأت

قلندر بخش نام۔ جُرأت تخلص۔ اکبر آبادی مشہور ہیں۔ مگر اِن کے والد دلّی کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں پہنچکر اُن کی غزلوں نے عزت پائی سن جوانی میں نابینا ہو گئے ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ میر انشا اور مصحفی کے ہمعصر تھے۔ ان کے کلام میں میر کی سی سادہ بیانی اور لُطف محاورہ تو ہے۔ مگر مضامین رندی و ہوا پرستی کی حد سے باہر کم نکلتے ہیں ۔

(۱)

غم رو رو کے کہتا ہوں کچھ اُس سے اگر اپنا
تو ہنس کے وہ بولے ہے "میاں! فکر کر اپنا"

باتوں سے کٹے کس کی بھلا راہ ہماری!
غربت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا

عالم میں ہے گھر گھر خوشی و عیش۔ پر اُس بِن
ماتم کدہ ہم کو نظر آتا ہے گھر اپنا

ہر بات کا بہتر ہے چھپانا ہی۔ کہ یہ بھی
ہے عیب۔ کرے کوئی جو ظاہر ہُنر اپنا

کیا کیا اُسے دیکھ۔ آتی ہے جرأت! ہمیں حسرت — مایوس جو پھر آتا ہے پیغامبر اپنا

۲

بلبل سُنے نہ کیونکہ قفس میں چمن کی بات — آوارۂ وطن کو لگے خوش وطن کی بات

عیش و طرب کا ذکر کروں کیا میں دوستو! — مجھ غمزدہ سے پوچھیے رنج و محن کی بات

شاید اُسی کا ذکر ہو۔ ہر رہگذر میں مَیں — سُنتا ہوں گوشِ دل سے ہر اک مرد و زن کی بات

جرأت! خزاں کے آتے چمن میں رہا نہ کچھ — اِک رہ گئی زبان پہ گل و یاسمن کی بات

(۳)

صوتِ بلبل دلِ نالاں نے سُنائی مجھکو — سیرِ گل دیدۂ گریاں نے دکھائی مجھکو

لاؤں خاطر میں نہ میں سلطنت ہفت اقلیم — اُس گلی کی جو میسّر ہو گدائی مجھکو

صُلح میں جس کی نہیں چین یہ اندیشہ ہے — آہ! دکھلائے گی کیا اُس کی لڑائی مجھکو

وصل میں جس کے نہ تھا چین سو جرأت! افسوس — وہ گیا پاس سے اور موت نہ آئی مجھکو

(۴)

اتنا بتلا مجھے ہر جائی ہوں میں۔ یار! کہ تو — میں ہر اک شخص سے رکھتا ہوں سروکار۔ کہ تو!

کم ثباتی مری ہر دم ہے مخاطب بحباب — دیکھیں تو۔ پہلے ہم اس بحر سے ہوں پار۔ کہ تو!

ناتوانی مری گلشن میں یہ ہی بکتی ہے — دیکھیں۔ اے نکہتِ گل! ہم ہیں سُبکبار۔ کہ تو!

دوستی کر کے جو دشمن ہوا تو جرأت کا — بیوفا وہ ہے۔ پھر اے شوخ ستمگار۔ کہ تو!

(۵)

دی خبر بیکِ صبا نے کیا یہ گلشن میں جو آہ! — غنچۂ پژمردہ ساں دل کی کلی مرجھا گئی

ضعفِ پیری روز اُس کا انتقام اب لے ہے آہ! — قبل ازیں عمرِ جوانی جو مزے دکھلا گئی

اُس سے کیوں بجتے ہے کیا سودا چڑھا تجکو دلا! — وہ نہیں گر آپ میں۔ تو تو ہی بس کر جا گئی
اے اجل! بس یہ تو رسوائی نہ دیکھی جائے گی — طبع غمخواروں کی اپنے اب بہت اُکتا گئی
اب ڈھٹائی سمجھیے یا اِس کو جرأت جانیے — آئینگے جی۔ آئینگے! اب تو طبیعت آ گئی

(۶)

مشکل ہے۔ جو آوے وہ احاطے میں خرد کے — گو اُس کا تصور کوئی اوراک سے باندھے
دعویٰ نہ کرے، برق کبھی اپنی تڑپ کا — گر پاؤں ترے توسنِ چالاک سے باندھے
قائل ہو وہ سنگھ۔ تو ابھی ڈر کے یہ بھاگیں — جو تیغ و سپر پھرتے ہیں بے باک سے باندھے

سیّد انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں نام۔ انشا تخلّص۔ شرفائے دہلی سے تھے۔ استعداد علمی میں لائق و فائق۔ فارسی۔ عربی۔ ترکی سے ماہر۔ شیخ مصحفی نے ان کو فیضی زماں لکھا ہے۔ کلام میں ہزل و ظرافت زیادہ ہے مگر جو صاف و سنجیدہ ہے وہ بے مثل و نظیر۔ میر و مصحفی و جرأت کے ہمعصر تھے نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے ۱۲۳۳ھ میں بحالت دیوانگی انتقال فرمایا ٭

(۱)

جس شخص نے کہ اپنے نخوت کے بل کو توڑا — راہِ خدا میں اُس نے گویا جبل کو توڑا
اپنا دلِ شگفتہ تالاب کا کنول تھا — افسوس تو نے ظالم! ایسے کنول کو توڑا
تھا ساعتِ فرنگی۔ دل چُپ جو ہو رہا ہے — کیا جانیے کہ کس نے ہے اس کی کل کو توڑا
دارا و جم نے تجھ سے کیا کیا شکست پائی — اے چرخ! تو نے کس کس اہلِ دول کو توڑا
لینی ہے جنسِ دل تو ظالم! تو آج لے چک — پڑ جائیگا دگر نہ پھر اِس کا کل کو توڑا
احوالِ خوش اُنھوں کا اِنشا میاں جنھوں نے — اُس ذاتِ بحت سے ہے بندِ اجل کو توڑا

(۲)

جھوٹا نکلا قرار تیرا — اب کس کو ہے اعتبار تیرا
واللہ! کہ کام آرہے گا — مجھ سا یک رنگ یار تیرا
گرجبر جہاں تلک تو چاہے — میرا کیا! اختیار تیرا
انشا سے نہ روٹھ مت خفا ہو! — ہے بندۂ جاں نثار تیرا

(۳)

شعلے بھڑک رہے ہیں یوں اپنے تن کے اندر — دوں لگ رہی ہو جیسے گرمی میں بن کے اندر
جو چاہو تم سو کہہ لو چپ چاپ ہیں ہم ایسے — گویا زباں نہیں ہے اپنے دہن کے اندر
گل سے زیادہ نازک جو دلبرانِ رعنا — ق — ہیں ہیکلی میں شبنم کے پیرہن کے اندر
ہے مجکو یہ تعجب سو دینگے پانوں پھیلا — یہ رنگ گورے گورے کیونکر کفن کے اندر
غم نے ترے بٹھایا۔ اے ماہِ مصر خوبی! — یعقوب وار ہم کو بیت الحزن کے اندر
یوں بولتا کہے ہے سنتے ہو میر انشا! — "ہیں طرفہ ہم مسافر اپنے وطن کے اندر"

(۴)

شادابی ہوا میں یہ کیفیت اب کے ہے — سو رنگ کے شگفتہ ہیں گل شاخسار پر
نظارہ سوے دانۂ شبنم اگر کروں — جاتی ہے جھٹ نگاہ پھسل سبزہ زار پر
اشجار جھومتے ہیں پڑے صحنِ باغ میں — تاک اینڈتے ہیں مست پڑے جوئبار پر
موج بہار لالۂ خودرو نے اے نسیم! — کچھ آگ سی لگائی ہے آکوہسار پر

(۵)

نکلے ہے خوں ٹھہر ٹھہر دل کے ہر اک خراش سے — چھیڑ دو اس کو دوستو! تیز قلم تراش سے

ہم کو مصاحبوں سے ہے آپ کے کیا برابری — ہم ہیں کمینہ اک غلام فرقۂ خواجہ تاش سے
موسم گل ہے دُوستو! جائے وہ سیرِ باغ کو — اُٹھنے کی تاب جس کو ہو تکیہ گہِ فراش سے
حضرت عشق! دیر میں رہتے ہو یا حرم میں تم — مجکو نہیں کچھ اطلاع آپ کی بود و باش سے
ہے یہ دور روزہ زندگی ہم کو وبال گردن آہ! — اے وہ خوشا! جو چھٹ گئے دغدغۂ معاش سے

(۶)

یہ جائے ترحم ہے۔ اگر سمجھے تو صیّاد — میں اور پھنسوں اِس طرح اِس کُنجِ قفس میں
آتی ہے نظر اُس کی تجلّی ہمیں زاہد! — ہر چیز میں ہر سنگ میں ہر خار میں خس میں
کیا پوچھتے ہو! عمر کٹی کس طرح اپنی — جز درد نہ دیکھا کبھی اِس تیس برس میں
ہر بات میں جلدی ہے ہر اک چیز میں اصرار — دُنیا سے نرالی ہیں غرض تیری تو رسمیں
انشا ترے گر گوشِ اصم ہوں نہ تو آدے — آواز تجھے یار کی ہر بانگ جرس میں

(۷)

نبھ گئی بندہ درگاہ سے اور آپ سے خیر! — ہم اُلفت میں اگر ایسے ہی آئین ہوے
راہ رو! چونک کہ ہے قافلہ میں تیاری — محمل اونٹوں پہ بندھے فوج میں سب زین ہوے
قمری و بلبل نالاں میں پڑے جو جھگڑے — سو دلِ غمزدہ کے موجب تسکین ہوے
اشک آنکھوں سے قدم رکھ نہیں سکتے باہر — دولتِ شرم سے مانندِ سلاطین ہوے
قصدِ بنگالہ مناسب ہی نہیں صاحب کو — گرچہ معلوم تجارت کے سب آئین ہوے
جی ہی اچھا نہ رہا پھر تو عیاذاً باللہ! — فائدہ کیا! جو شناسائے اراکین ہوے

(۸)

کر بیٹھے وہیں فضلِ خدا داد پہ تکیہ — جب بن نہ پڑی بات کچھ اپنی تگ و دو سے

جاں اہلِ توکل اُنھیں اشخاص کو جو ہیں
محظوظ پیاز و نمک و گردہ جو سے
اے دل! وہ خوشا کشت برومند کہ جس کو
خطرہ ہی نہیں تہلکۂ وقتِ دِرَو سے
افواجِ گُل و لالہ میں ہے زلزلہ انشا
اِس بادِ بہاری کی سواری کی جِلو سے

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

غلام ہمدانی نام مصحفیؔ تخلص۔ وطن اصلی امروہہ۔ دلّی میں آکر علوم رسمیہ حاصل کیے۔ آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ پہنچے۔ اور ریختہ گوئی میں میرؔ و سوداؔ کے بعد علمِ اُستادی بلند کیا خود فرماتے ہیں ؎ اے مصحفیؔ شاعر نہیں پورب میں ہُوا میں + دلّی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا + ان کا کلام نہایت صاف و شستہ ہے کہیں بطرزِ سوداؔ کہیں بطرزِ میرؔ +

(۱)

نظّارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا
یاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا
کیا لطف مقام اُن کو! جو مشتاقِ عدم ہیں
دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا
کیا بھیجیئے قاصد کو وہاں! کوچہ میں جس کے
جبریل کو مقدور نہیں نامہ بری کا
تربت پہ مری برگِ گُلِ تازہ چڑھائے
احسان ہے مجھ پر یہ نسیمِ سحری کا
بندہ ہے ترا مصحفیؔ خستہ کو یا رب!
محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

(۲)

بوئے محبت اپنی رکھی خدا نے اُس میں
سینہ میں آدمی کے دِل عطرداں بنایا
اپنی تو اس چمن میں عمر اِس طرح سے گزری
یاں آشیاں بنایا۔ واں آشیاں بنایا
گرمِ سفر رہے ہم منزل کو پر نہ پہنچے
آوارگی نے ہم کو ریگِ رواں بنایا
اے مصحفیؔ! گریباں سارا لہو سے تر ہے
یہ رنگ اپنا ظالم! تو نے کہاں بنایا

(۳)

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا — اپنے رہنے کو مکاں چاہیئے تنہائی کا
شیشۂ دل کو مرے چور کیا کیوں اُس نے؟ — گیا بگاڑا تھا بھلا گنبدِ مینائی کا
بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مُدام — کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا
مصحفی! ریختہ پہنچا مرا کس رتبہ کو — شوریاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

(۴)

کیا غیر کا کھٹکا ہے؟ کہ میں کچھ نہیں کہتا — یہ مُنھ مجھے تیرا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
دیوانے جو ہوتے ہیں کہا کرتے ہیں کیا کیا — مجکو یہی سودا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
جو چاہتے ہیں۔ مجکو وہ کہتے ہیں۔ خدایا! — تو عالم و دانا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
اے مصحفی! بعضے مرے کہنے کے ہیں قائل — بعضوں کا مقولا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

(۵)

بوئے خوں دیتا ہے کچھ مجکو یہ گلشن اے صبا! — ہے شہیدوں کا یہاں کس کس کے مدفن اے صبا!
کس کے ماتم میں ہوئے ہیں گُل ہزاروں سینہ چاک — بلبلیں کرتی ہیں کس کشتہ پہ شیون اے صبا!
ہم اسیرانِ قفس کو تب خبر دی تو نے آہ! — لُٹ گئے جب باغ میں پھولوں کے خرمن اے صبا!
ڈال کر شبنم کے مُندرے بے تکلف کان میں — اب کے ہولی میں بنا ناگُل کو جوگن اے صبا!

۶

معشوق ہوں یا عاشقِ معشوق نُما ہوں — معلوم نہیں مجکو۔ کہ میں کون ہوں۔ کیا ہوں
ہوں شاہدِ تنزیہ کے رُخسارہ کا پردہ — یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں
ہستی کو مری ہستیِ عالم نہ سمجھنا — ہوں ہست مگر ہستیِ عالم سے جُدا ہوں

انداز ہیں سب عاشق و معشوق کے مجھ میں
سوز جگر و دل ہوں۔ کبھی ناز و ادا ہوں

ہے مجھ سے گریبانِ گل و صبح معطّر
میں عطرِ نسیم چمن و بادِ صبا ہوں

گوش شنوا ہو۔ تو مرے رمز کو سمجھے
حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی صدا ہوں

یہ کیا ہے۔ کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا
ہر چند۔ کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں

اے مصحفی! شانیں ہیں مری جلوہ گری میں
ہر رنگ میں ہیں مظہرِ انوارِ خدا ہوں

(۷)

چہرہ اُتر رہا ہے۔ نقشے بگڑ رہے ہیں
کچھ۔ ان دنوں تو تیرے جوبن سے جھڑ گئے ہیں

تلوار سج کے جب وہ نکلا ہے گھر سے باہر
کشتوں کے ہر گلی میں ستھراؤ پڑ گئے ہیں

روتا پھروں نہ کیونکر میں قافلے سا ہر سو
منزل پہ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں

اے مصحفی! میں رووں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

(۸)

فلک کی خو نہیں ایسوں کی پرورش۔ ورنہ
شکستہ حال و غریب و فقیر ہم بھی ہیں

یہ درمیاں جو ہمیں بگاڑ رہتا ہے
وہی شریر نہیں۔ کچھ شریر ہم بھی ہیں

حسد کی جا نہیں اے مصحفی! کلام اُن کا
کہ اپنے عہد کے مرزا و میر ہم بھی ہیں

(۹)

نو بہار آئی ہے۔ سودائے کہن تازہ ہوا
سبزہ کی موج نے پھر سلسلہ جنبانی کی

ہوں وہ غارت زدہ رہرو۔ کہ نمودار ہے صاف
میری صورت سے حقیقت مری ویرانی کی

محو ہر دم جو رہے اپنی ہی آرائش کا
اُس کو کیا فکر مری بے سر و سامانی کی

مصحفی! دوں میں جہاں ریختہ گوئی کو رواج
قدر شیرازی کی ہو واں۔ نہ صفاہانی کی

میر محمد تقی میر

حالات کے لیے دیکھو صفحہ ۲۰ حصہ نظم

(۱)

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟
قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل! ہم چلے سوتا ہے کیا؟
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا؟
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میر اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا؟

(۲)

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
خیال بھی کبھو+ گذرا نہ پر فشانی کا
نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

(۳)

طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا
نہ پیش آئے اگر مرحلہ جدائی کا
یہیں ہیں دیر و حرم - اب تو یہ حقیقت ہے
دماغ کس کو ہے ہر در کی جبہہ سائی کا
کبھو+ پہاڑ میں جوں کوہکن سر اپنا ماریں
خیال ہم کو بھی ہے بخت آزمائی کا
رکھا ہے باز ہمیں دربدر کے پھرنے سے
سروں پہ اپنے ہے احساں شکستہ پائی کا
جہاں میں میر ہی کے ساتھ جاتا تھا لیکن
کوئی شریک نہیں ہے کسو‡ کی آئی کا

+ متروک کبھی مستعمل ۱۲ + متروک کبھی مستعمل ۱۲ ‡ متروک کسی مستعمل ۱۲

(۴)

مہر کی تجھ سے توقع تھی ۔ ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو ۔ سو پتھر نکلا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے ۔ کہ اس راہ سے لشکر نکلا

اشک تر ۔ قطرۂ خوں ۔ لخت جگر ۔ پارۂ دل
ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہتر نکلا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

(۵)

مستوجب ظلم و ستم و جور و جفا ہوں
ہر چند کہ جلتا ہوں ۔ پہ سرگرم وفا ہوں

اس گلشن دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں
ہوں غنچۂ افسردہ ۔ کہ مردود صبا ہوں

گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب
بارے یہ غنیمت ہے ۔ کہ جیتا تو رہا ہوں

سینہ تو کیا فضل الٰہی سے سبھی چاک
ہے وقت دعا میرؔ ۔ کہ اب دل کو لگا ہوں

(۶)

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

دیکھا ہے مجھے جس نے ۔ سو دیوانہ ہے میرا
میں باعث آشفتگی طبع رواں ہوں

ہوں زرد غم تازہ نہالان چمن سے
اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہش دل بسکہ پریشاں
درپے نہ ہو ۔ اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

(۷)

رکھیے گردن کو تری تیغ ستم پر ۔ ہو سو ہو
جی میں ہم نے یہ کیا ہے اب مقرر ہو سو ہو

قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیش سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ! ہو سو ہو

بندہ میں ناز و نعم ہی کے رہے کیونکر فقیر
یہ فضولی ہے۔ فقیری میں مُیسّر ہو سو ہو
صاحبی کیسی؟ جو تم کو بھی کوئی تم سا ملا
پھر تو خواری بے وقاری بندہ پرور! ہو سو ہو
کہتے ہیں ٹھہرا ہے تیرا اور غیروں کا بگاڑ
ہیں شریک اے میرؔ ہم بھی تیرے بہتر۔ ہو سو ہو

(۸)

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں
مرو یا جیو کوئی اُس کی بلا سے
نہ رکھی مری خاک بھی اُس گلی میں
کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے
اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے
تعجب مجھے ہے عجب ماسوا سے
تک اے مُدعی! چشم انصاف وا کر
کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے
نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میرؔ جی! آج کیوں ہو خفا سے

(۹)

اپنی ہستی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
چشم دل کھول اس ہی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
میں جو بولا کہا۔ کہ "یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے"

(۱۰)

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم
جی کچھ اُچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے
جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے
آنکھوں ہی میں رہے ہو۔ دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں میں۔ یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے

اِتنی بھی بد مزاجی! ہر لحظہ میرؔ تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

مرزا رفیع سودا

مرزا محمد رفیع نام سودا تخلص سنہ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے دلّی ان کا مولد و مسکن ریختہ گوئی میں شاہ حاتم کے شاگرد سنہ ۱۱۸۵ ہجری میں لکھنؤ چلے گئے سنہ ۱۱۹۵ ہجری میں وہیں انتقال فرمایا - ان کا کلام رنگا رنگ ہے کہیں صاف و سادہ کہیں تشبیہ و استعارہ ۔ فارسی ترکیبوں کا استعمال بخلاف میر کے زیادہ - اگرچہ اصناف سخن میں اُستاد مسلّم ہیں - مگر ان کے قصائد اور ہجویں خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں ۔

(۱)

مقدور نہیں اُس کی تجلّی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردہ کو تعیّن کے درِ دل سے اُٹھا دے
کُھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کُھلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

(۲)

گلہ لکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے
کہ جن[لہ] نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

دماغ جھڑ گیا آخر نہ تیرا اے نمرود!
چلا نہ پشہ سے کچھ بس تری خدائی کا

طلب نہ چرخ سے کر نان راحت اے سودا!
پھرے ہے اپنا وہ کاسہ لیے گدائی کا

(۳)

لطف اے اشک! کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم - اے آہِ شرربار! کہ جل جاؤں گا

قطرۂ اشک ہوں پیارے! مرے نظّارہ سے
کیوں خفا ہوتے ہو! پل مارتے ڈھل جاؤں گا

لہ متروک جس مستعمل ۱۲

اِس مصیبت سے تو مت مجکو نکال اب گھر سے
تو کہے "آج ہی جائیں" کہوں "کل جاؤں گا"

چھیڑ مت بادِ بہاری! کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

کہتے ہیں وہ جو ہے سوداؔ کا قصیدہ ہی خوب
اُن کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

(۴)

قاصدِ اشک آکے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

دیکھیے! درماندگی اب کیا دکھائے
قافلہ یاروں کا سفر کر گیا

کیونکر کوئی کھائے ترا اب فریب
حال مرا سب کو خبر کر گیا

ایک جو مانندِ گُل اِس باغ سے
خرم و خنداں ہو گذر کر گیا

آن کے شبنم کی طرح دوسرا
شام سے رو رو کے سحر کر گیا

کیا تجھے اب فائدہ اِس فکر سے
ہر کوئی اِک طرح بسر کر گیا

(۵)

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں! ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھائے
جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سوداؔ
اُسے تیرے کوچہ میں کم دیکھتے ہیں

(۶)

مجمر کا دخل کیا ہے محفل میں تفتگاں کی
بو داغِ دل کی اپنے ہم عود جانتے ہیں

اپنا چراغِ دل کا جس دم سے بجھ گیا ہے
ہم گھر کو آسماں کے پُر دود جانتے ہیں

آئینہ سازی اُن کو ہے کفر اے سکندر!
جو مردِ شکلِ ہستی نابود جانتے ہیں

جس خشت کو اُٹھا کر دیکھیں وہ چشمِ دل سے
صورت کو اپنی اُس میں موجود جانتے ہیں

کیا شکر کیا شکایت اپنی ہی شکل سے ہے
دونوں سے آپ کو ہم مقصود جانتے ہیں

عزّ و غرور دونوں اپنی ہی ذات میں ہیں
ہم عبد سے جدا کب معبود جانتے ہیں

ہم سر نوائیں کس کے آگے ؟ کہ بیدؔ آسا
اپنے قدم کو اپنا مسجود جانتے ہیں

(۷)

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی
دھر
شبنم بھی اِس چمن سے صبا! چشم تر گئی

کیجو اثر قبول۔ کہ تجھ تک ہماری آہ
لخت
سینہ سے ارمغاں لیے داغِ جگر گئی

دیوانہ کون گُل ہے ترا جس کو باغ میں
زنجیر کرنے موجِ نسیمِ سحر گئی

خانہ خراب دل تو ہے لیکن میں کیا کہوں
جیسی بلائے جان ہے یہ آنکھ گھر گئی

مت پوچھ یہ۔ کہ رات کٹی کیونکہ مجھ بغیر
اس گفتگو سے فائدہ پیارے! گذر گئی

ظالم کرو ڑ گل کا گریباں ہوا ہے چاک
ایک عندلیب گر اجل اپنی سے مر گئی

پروانہ کون سا نہ جلا شام کو۔ کہ شمع
روتی ہوئی نہ بزم سے وقتِ سحر گئی

(۸)

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے (دیکھو تو) کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور مرا عجز تا کجا۔ ظالم!
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

زبانِ شکوہ سو اب زمانہ میں ہیہات!
کوئی کسی سے بجز آشنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر ؟ صیّاد!
چمن چمن کہیں بُلبل کی اب نوا بھی ہے؟

سمجھ کے رکھیو قدم خارِ دشت پر مجنوں
کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر دردؔ

خواجہ میر نام۔ دردؔ تخلص۔ دہلی کے ارباب طریقت وارشاد سے تھے۔ ان کا دیوان ریختہ نہایت مختصر ہے غزلیات تمامتر عارفانہ۔ خوبی زبان وسادگی بیان کے لحاظ سے مقبول خاص وعام۔ میرؔ و مرزاؔ کے ہمعصر تھے۔ ۱۱۹۵ھ ہجری میں بعمر ۶۸ سال رحلت فرمائی ✣

(۱)

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا
حقّا! کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

اُس مسندِ عزّت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب؟ گذر ہووے تعقّل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن
آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے
اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ! کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

(۲)

سب کے ہاں تم ہوے کرم فرما
اِس طرف کو کبھو گذر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا تو نے رحم پر نہ کیا

آپ سے ہم گذر گئے کب کے
کیا ہے! ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کونسا دل ہے وہ؟ کہ جس میں آہ!
خانہ آباد! تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے دردؔ!
بے ہنر! تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۳)

لیکر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے
گر درمیاں حساب نہ ہو سال و ماہ کا

رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری ادھر
یارب سبے کون پھر تو ہمارے گناہ کا

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نے تاج کی ہوس۔ نہ ارادہ کُلاہ کا

سو بار دیکھیں میں نے تری بیوفائیاں
تِس پر بھی نِت غرور ہے دل میں نباہ کا

اے درد! چھوڑتا ہی نہیں مجکو جذبِ عشق
کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگِ کاہ کا

(۴)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک! جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے۔ جو کچھ آرزو کریں

تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جا۔ ابھی
دامن نچوڑ دیں۔ تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال! جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئنہ ہوں۔ پر اتنا ہوں ناقبول
منھ پھیر لے وہ۔ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گُل کو ہے ثبات۔ نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن! ہوسِ رنگ و بو کریں

۵

یاں عیش کے پردہ میں چھپی دل شکنی ہے
ہر بزمِ طرب جوں مژہ برہم زدنی ہے

آگے جو بلا آئی تھی۔ سو دل پہ ٹلی تھی
اب کے تو مری جان ہی پر آن بنی ہے

اے درد! بتا کس سے کہوں رازِ محبت
عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

(۶)

دیکھئے جس کو یاں اُسے اور ہی کچھ دماغ ہے
کرمکِ شب چراغ بھی گوہرِ شب چراغ ہے

غیر سے کیا معاملہ؟ آپ ہیں اپنے دام میں
قیدِ خودی نہ ہو اگر پھر تو عجب فراغ ہے

حال مرا نہ پوچھیے میں جو کہوں سو کیا کہوں؟
دل ہے سو ریش ریش ہے سینہ سو داغ داغ ہے

سنتے ہیں یوں۔ کہ آہ تو ہم ہی میں چھپ رہا کہیں؟
اپنی تلاش سے غرض ہم کو ترا سراغ ہے

غفلتِ دل ہوئی مگر پنبۂ گوشِ خلق درد!
بلبل داستاں سرا ورنہ ہر ایک زاغ ہے

قصائد

امیر الشعرا منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی

تختِ کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہِ قلم
دائرے طبل کی صورت ہیں، الف شکلِ علم

ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف و حرکات
یہی لشکر ہے یہی فوج - یہی خیل و خدم

ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت ہے ندیم
وزرا مرتبہ و دبدبہ و جاہ و حشم

منتخب ہیں جو مضامیں - تو معانی ہیں لطیف
ہیں وہی گنج و خزائن - وہی دینار و درم

اہلِ دفتر نے جو کی کھول کے بستوں کو نشست
گردنِ منشیٔ گردوں ہوئی تسلیم کو خم

کبھی منصب کبھی تقسیم میں دیں جاگیریں
شقّے لکھے گئے ہونے لگے فرمان رقم

وقت دربار ہوا - جمع ہوئے مجرائی
عقل و فہم و خرد و ہوش و تدابیر و حکم

سامنے آنے لگے خیر طلب بہرِ سلام
مِردہا تھا جو ادب کا - وہ پکارا ابہیم

روبروِ خسروِ جم جاہ فلک فر کے نگاہ
تا ابد سلطنتِ پشت و پناہِ عالم

ہوئی مجرے سے بخوبی جو فراغت حاصل
مسند حکم ہوئی مطلعِ انوارِ قدم

روبرو دستخطِ خاص کو لایا کاغذ
حکمت الدولہ - جو تھا منشیٔ یاقوت رقم

عرضیاں گزریں - خلائق کے برآئے مطلب
لب ہوئے لعل فشاں کھل گئے ابوابِ کرم

بعد اخبار کے پرچوں کی جو نوبت آئی
نئے مضمون کا اک پرچہ ہوا پیش اس دم

کہ ملازم ہیں جو سرکار کے یہ دانش و وہم
درِ دولت پہ ہے ہنگامہ لڑے ہیں باہم

بحث اِک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی
کہ ہم گتھ گئے ہیں صورتِ خطِ توام

حکم عالی یہ ہوا۔ جلد کرو حاضر بزم
دیکھیں کیا کہتے ہیں؟ خود دونوں میں ہم ہونگے حکم

حاضر بزم ہوئے وہ تو ہوا یہ ایما
کیوں لڑے؟ کیا سببِ جنگ ہے آگاہ ہوں ہم

عرض دانش نے یہ کی۔ روزِ ابد تک قائم
یہ حکومت۔ یہ ایالت۔ یہ شہامت۔ یہ حشم

بندۂ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انساں
حکمرانانِ زمانہ رؤسائے عالم

ایک حاکم ہے۔ فلک جاہ۔ خردمند۔ ذکی
صاحبِ علم و ہنر۔ معدنِ اخلاق و کرم

نام ہے کلب علی خان بہادر جم جاہ
جس کے خدام ہیں ہم مرتبۂ قیصر و جم

علم میں حلم میں۔ جود و کرم و ہمت میں
ہے وہ یکتائے زمانہ سرِ اقدس کی قسم!

جس میں جو بات ہو کیونکر اُسے کوئی نہ کہے
پیشِ انصاف گزیں حق کا چھپانا ہے ستم

میرے کہنے کو ذرا وہم نے باور نہ کیا
بلکہ مارا رہِ انکار میں منکر نے قدم

کہ کمالات کا حصر ایک میں ہے ناممکن
کارخانہ ہے خُدا کا۔ نہیں خالی عالم

ایسے کیسے نہیں گزرے ہیں جہاں میں نامی؟
خواجگانِ عربستان و صنادیدِ عجم

سارے عالم میں ہے سحباں کی فصاحت مشہور
سارے آفاق میں کسریٰ کی عدالت ہے علم

کس کو معلوم فلاطوں کی نہیں ہے حکمت؟
حکمِ نادر ہے عیاں جلوہ نما عشرتِ جم

چار سو ہمتِ حاتم کا ہے آوازہ بلند
شش جہت پر ہے عیاں سب سے جری تھا رستم

تو جو کہتا ہے کہ ان سب سے ہے بڑھ کر کوئی
زعم باطل ہے فقط۔ مانتے ہیں کب اسے ہم

میں یہ کہتا ہوں ہیں دعوئی میں ہوں اپنے صادق
ہیں دلائل۔ جو ہوں گوش شنوا گوشِ اصم

کچھ یہ سنتا نہیں انکار پہ باندھی ہے کمر
گفتگوئے طرفین آپ سُنیں ہو سکے ہم

ہو گیا حکم کہ ہاں محکمۂ بحث ہو گرم
ایک اک بات کا ہو فیصلہ۔ لا ہو کہ نعم

(۲)

فصلِ گل آئی ہُوا گلزارِ جنت بوستاں — بڑھ کے رضواں سے ہے ان روزوں دماغِ باغباں

ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھِلے — جیسے صبحِ عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں

خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر — کر رہی ہیں سجدۂ شکرِ خدائے اِنس و جاں

"قم باذن اللہ" کہتی آئی گلشن میں بہار — جی اُٹھے جو ہو گئے تھے مُردہ دل وقتِ خزاں

جھوم کر آیا ہے ابر کوہساری باغ میں — رقص میں ہیں ہر روش طاؤس ہو کر شادماں

لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں؟ آ کر دیکھ لیں — صاف جلوہ ہے چراغِ طور کا مجھ سے عیاں

بھو مناستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا — نکہتِ گل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں

لالۂ احمر نے یاقوتی کی ڈبیا کی درست — نرگسِ شہلا نے رکھی مے فروشی کی دُکاں

داربستِ تاک میں خوشے نظر آنے لگے — جس طرح جُھرمٹ ستاروں کا فرازِ آسماں

سیمِ غنچہ کیوں نہ بیحد ہو زرِ گل بے شمار — رکھتی ہے اکسیر کی بوٹی بہارِ بوستاں

ہر روش پر بیٹھی ہے بزّازِ بن کر خُرّمی — جس طرف دیکھو کھُلی ہے سبز مخمل کی دکاں

فیضِ شبنم نے دیے اشجار کو آبی لباس — بر میں ہے مردم گیا کے جامۂ آبِ رواں

نو عروسانِ چمن کو ہے جواہر کا جو شوق — بھیجنے فیروزہ آیا ہے چمن میں آسماں

یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہالِ سایہ دار — ہو خراماں جس طرح کوئی حسیں دامن کشاں

ہے مبارک فال۔ کوئی ہونے والی ہے خوشی — ہر چراغِ لالہ جوشِ رنگ سے ہے گل فشاں

جان پھولوں میں پڑی۔ زندہ ہوئی خاکِ چمن — ہے دمِ جاں بخشِ عیسیٰ یا نسیمِ بوستاں

قمریوں کا قول ہے "ہم ہیں طیورِ باغِ خلد" — سرو کہتا ہے۔ کہ "میں ہوں طوبیٰ باغِ جناں"

صحنِ گلشن میں نزاکت نے جمایا ہے یہ رنگ — مُرغِ بو کا آشیاں ہے شاخِ گلبن پر کہاں

ہے بلندی و درازی اِس قدر ہر شاخ میں
ہے محیطِ مشرق و مغرب برنگِ کہکشاں

پائے گر سورج مُکھی کے سایہ میں تھوڑی جگہ
بھول جائے مہر جنبش مثلِ قطبِ آسماں

چودھویں کا چاند ہے جو چاندنی کا پھول ہے
چادرِ مہتاب ہے فرشِ فضائے بوستاں

سیر کو جو آئے اُس کا نافِ آہو ہو مشام
گیسوئے مشکین سنبل بسکہ ہے عنبر فشاں

دیدۂ بیدار نرگس کا تو کیا مذکور ہے
خواب میں کرتا ہے سبزہ سیر گلزارِ جناں

ہے تبسم غنچۂ گل کا کہ تیغ آبدار
نوک کی لیتے ہیں کانٹے یا چبھوتے ہیں سناں

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب شمس العلما۔ ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

اگرچہ دیر سے ہیں مجتمع خواص و عوام
پر اس میں شک نہیں جلسہ ہے اب کا بے ہنگام

کسی طرف سے بھی آوازِ خوش نہیں آتی
کچھ ایسا بگڑا ہے نظمِ لیالی و ایام

وہ بمبئی۔ کہ جو تھا مرکزِ تجارت ہند
وبا نے کر دیا گویا کہ اُس کا کام تمام

مقام۔ رت جگے رہتے تھے جن میں ساری رات
وہ کر رہے ہیں پڑے بھائیں بھائیں اوّلِ شام

حکایتیں جو مصائب کی اُن کے سنتے ہیں
تو دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں ہم کلیجہ تھام

خُدا ہی جانے ہوئیں کتنی عورتیں بیوہ
خُدا ہی جانے ہوئے بچے کس قدر ایتام

جلا وطن ہوئے کتنے۔ کہ جو نہ ٹھہر سکے
کوئی سِلون کو بھاگا۔ کوئی گیا آسام

مگر پناہ نہیں آہوے حرم کو بھی
کہیں جہان میں جس دم قضا بچھائے دام

مرا تو کرتے ہیں لیکن نہ یوں۔ مفاجاۃً
تپ آئی صبح کو دن چڑھتے ہو گیا سرسام

ہوئی دوپہر۔ تو دُنیا سے ہو گئے رخصت
کہ تپ کے ساتھ ہی آیا تھا مرگ کا پیغام

ہزاروں آدمی گر جاں بحق ہوئے تو ہوئے
یہ کیا غضب ہے! ہوئی طب رہی سہی بدنام

علاج جتنے کئے سب کے سب گئے بے سود
بتائیں جتنی تدابیر سب رہیں ناکام

بس اب کھلا کہ طبابت کی اتنی ہستی ہے | کہ جھٹ سے لکھ دیا خیساندہ از برائے زکام
سکنجبین کو فرمایا قاطعِ صفرا | مریض یبس کو بتلایا روغنِ بادام
بنی جب آن کے جانوں پہ اور رہے عاجز | تو ایسی طب کو سلام اور سلام اور سلام
دوا کا حیلہ ہے۔ گر وقت ابھی نہیں آیا | تو ہوتے دیکھا ہے چٹکی سے خاک کی آرام
اور آن پہنچا ہے وعدہ تو بس سمجھ رکھو | دعا دوا۔ کوئی تدبیر بھی نہ آئے کام
ادھر وبا نہیں۔ پر قحط اور گرانی سے | مچا ہوا ہے ہر اک گھر میں رات دن کہرام
غلط۔ کہ عید ہوئی۔ کوئی ہم کو سمجھا دے | یہ فاقے کیسے؟ اگر ہو چکا ہے ماہِ صیام
ہمیں تو بے زری اور مفلسی نے مار دیا | دگرنہ کیا تھا۔ جو ہوتے گرہ میں اپنی دام
وبا و قحط سے باقی بچا کیا اُجڑنے میں؟ | مگر بھلے کو نگہبانِ خلق تھے۔ حکام
کجا فراغ! خوشی کیسی! کس کا اطمیناں! | ان آفتوں کے سبب ہو رہی ہے زیست حرام
پھری ہوئی ہے خدا کی نظر کچھ ان روزوں | کہ ہم نے توڑے ہیں اُس کے ضوابط و احکام
بساط یہ ہے۔ اور اِس پر گناہ کی جرأت | نمود یہ ہے۔ اور اِس پر قصور کا اِقدام
سوائے توبہ نہیں کچھ علاجِ قہرِ خدا | طبیب ہو کہ طبابت کسی پہ کیا الزام!
وہ چاہے مار دے ہم سب کو بے وبا بے قحط | بقا تجھی کو ہے۔ اے ذوالجلال والاکرام!
گنہگار رہیں۔ پر معترف قصور کے ہیں | وسیع ہے تری رحمت۔ کرم ہے تیرا عام
جئیں تو خوش جئیں۔ اور امن و عافیت سے جئیں | جب آئے موت۔ تو سب کا بخیر ہو انجام

حکیم مومن خاں مومن

کوئی اِس دَور میں جیئے کیونکر | ملک الموت ہے ہر ایک بشر
داد خواہوں کے شور سے۔ دیکھو | چونک پڑتا ہے فتنۂ محشر

ہجو

اُنہوں نے بھی اِس زمانہ میں — تیغ کے سے نکالے ہیں جوہر
ہے پئے اشتیاق ویرانی — شاہ فرہاد و بے ستون کشور
نہ امیروں کو پاے بندی عدل — نہ رعایا مطیع و فرماں بر
اُس کو شورِ ستم زماں کا خطاب — جو کرے قتل خُرد سالہ پسر
چمن آرا کو رسم پیرائش — اِک بہانہ ہے بہرِ قطعِ شجر
پاکے الزام دست خالی سے — فلسفی پیٹتا ہے اپنا سر
آب و ناں کے لئے گرو رکھیں — رستمانِ زمانہ تیغ و سپر
شعرا کو یہ آرزوے شعیر — خوانِ عیسیٰ ہے نیم خوردہ خر
کام آئے نہ نغمۂ شیریں — طوطیوں کو ہے حسرتِ شکّر
سرورانِ سپہر مرتبہ ہیں — بسکہ جاہل نواز دوں پرور
واعظوں کی زباں پہ آتا ہے — برملا شکوہ قضا و قدر
کہے مفتی سوال کو واجب — کسب مفقود جو ہوے یکسر
پھلے پھولے ہیں بے خرد-کیا دور — بید مجنوں بھی گرے آئے ثمر
سختی و کاہلی کی دولت سے — دامنِ کوہ میں ہیں لعل و گہر
باندھتے ہیں سخن سرا موزوں — کس طرح ہو نصیب سرو کو بر
قدر دانی کا نام ہی نہ رہا — چند ناداں ہوئے ہیں نام آور
ایک امیر سخن شناس نہیں — لاکھ ہیں شاعرِ ثنا گستر
اے لبِ یاوہ گوے ہرزہ درائے — بس کہاں تک یہ ناستودہ سمر
ہجو گوئی نہیں ہمارا کام — ایسی باتوں سے خامشی بہتر

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ہاں مہِ نو! سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز۔ اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے۔ گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص!
حبذا اے نشاطِ عامِ عوام!

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لیکے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا؟ کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور تیرا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھکو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟

جانتا ہوں۔ کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے اُمیدگاہِ انام

میں نے مانا۔ کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں۔ کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ اِستفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ!
قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھکو کیا پایہ روشناسی کا
جُز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں۔ کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون!
مجھکو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اَور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجکو فرِّ فروغ | کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی | کر چکی قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر | کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز | اپنی صورت کا اک بلوریں جام
کہہ چکا میں تو سب کچھ۔ اب تو کہہ | اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام!
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا | ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام؟
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن | نام شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ | مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شیخ ابراہیم ذوق

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت | نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے | تھا تصوّر مرا ہر امر میں تصدیق صفت
جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام | عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت
ذہن میں سب مرے حاضر صُوَرِ علمیّہ | پہ جتانی نہ تھی منظور مجھے علمیّت
چارہ و ناچار جو ترغیب سے یاروں کی کبھی | درس و تدریس پہ آجاتی تھی مجکو رغبت
کبھی ہمت تھی مری قاعدۂ صرف میں صرف | کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویّت
کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں | کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت
کبھی تھا علمِ الٰہی کی طرف ذہنِ رسا | کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی تھی عرصۂ تدویرِ فلک کی مجھے سیر | کبھی میں ناپتا تھا سطح زمیں کی وُسعت
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش | کبھی مُثبت مرے نزدیک زمیں کی حرکت

کبھی منقول پہ مائل کبھی سوئے معقول
کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوئے حکمت

کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریح علاج
کبھی میں کرتا تھا قاموس میں تصحیح لغت

کبھی میں لون سے بینندۂ بیمار و صحیح
کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوّت

گہ نباتات کی آگاہ میں کیفیت سے
گہ جمادات کی معلوم مجھے خاصیّت

جوں مہندس کبھی مالوف بہ شکل و مقدار
جوں محاسب کبھی مصروف بہ ضرب و قسمت

کبھی کرتا تھا قرانِ مہ و زہرہ پہ نظر
کبھی تھا دیکھتا تربیع و زحل کی رجعت

کبھی تھا علمِ قیافہ میں یہ ادراک مجھے
ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت

کبھی میں شاعرِ غرا و ادب دانِ بلیغ
نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت

کبھی کرتا تھا عروضی کا کبھی میں قافیہ تنگ
طبعِ موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت

کبھی پیشِ نظر انجیل و زبور و توریت
کبھی مصحف میں نظر میری سرِ ہر آیت

کبھی یہ آگہی شاستر و بید و پران
کروں اک بات میں پنڈت کی کتھا میں کھنڈت

آخرش دیکھا۔ تو العلم حجابُ الاکبر
عاقبت پایا۔ تو ہاں آبلہ کو اہلِ جنت

فائدہ کیا؟ کہ جو ہر علم کی جانی تعریف
فائدہ کیا؟ جو ہوئی آگہی ہر ملّت

بے مقدر نہ پڑے صورتِ بہبود نظر
دُور آئینۂ دل سے نہ ہو زنگِ کلفت

(۲)

واہ وا! کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا!
مثل نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار!
بن گیا گلزار عالم رشکِ صد دار الشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر
شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو و نما

ہوگیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں
ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اِس قدر پیدا لہو
پائی یہ اِصلاح صفرا نے کہ دُنیا میں کہیں
ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں
نام کو اشیا میں نے تلخی رہی نے سمیت
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
نیش کی جانوش ہو دُنبالۂ زنبور میں
راحت و آرام کا اِس دَور میں ہے دَور دَور
موتیا بند آنکھ میں اپنے جو رکھتی تھی صدف
آگیا اصلاح پر ایسا زمانہ کا مزاج
نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب
فرق جاتا یاں تک اعضاے بدن سے درد نے
لاغروں کو ہو کمالِ تاب و طاقت یہ شتاب
صُبحِ صادق کے ہے گو سر میں سپیدی آگئی
بھوک کی شدت سے اُس کو اک نفس فرصت نہو
رات بھر ٹھونسا کیا انجم کے تارے چرخ پیر
پہنچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوتنخانہ میں
پوست پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
ہضم کا اِس قدر معدہ نے پہنچایا بہم
بیدِ مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
برگ میں ہر نخل کے سُرخی ہے جوں برگِ حنا
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
بنگئی تریاک افیوں۔ زہر میٹھا ہوگیا
نیش کی جا نوشِ حنظل دیوے شربت کا مزا
کام میں افعی کے ہو مُہرہ بجاے آبلا
چاہیئے واقف نہ ہو دورانِ سر سے آسیا
اب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
کہتا ہے بیمار بس کر مجکو ہے بالکل شفا
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جُدا
کیسے دو ہفتے ہلال اک شب میں ہو بدرُ الدُّجا
لیکن اِس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا
قرص سے خورشید کے جب تک نہ کر لے ناشتا
پھر جو دیکھا صبح کو۔ اصلا شکم میں کچھ نہ تھا
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا
جوں حباب اُس کے نہیں مطلق شکم میں امتلا
جیدالکیموس ہے جو حلق سے اُتری دوا

ہے مزاجِ اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال ۔۔۔ ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخطِ استوا
رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس ۔۔۔ باغِ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا
دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو ۔۔۔ پھینک دیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

(۳)

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں ۔۔۔ کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں
ہے بادۂ نشاط و طرب سے لبالب آج ۔۔۔ اِک عمر سے پڑا تھا تہی ساغر آسماں
دیکھے نہ اِس طرح کا تماشا جہان میں ۔۔۔ گر ہو تمام چشم تماشا گر آسماں
اِترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے ۔۔۔ سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں
افراط انبساط سے ہے کیا عجب۔ اگر ۔۔۔ مثلِ حباب جامے سے ہو باہر آسماں
شادی کی اُس کی دھوم ہے آج آسمان تک ۔۔۔ تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں
فرزند شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار ۔۔۔ تسلیم کو ہے جس کے جُھکاتا سر آسماں
ہے اُس کی بارگاہ میں مانند چوبدار ۔۔۔ حاضر عصائے کاہکشاں لیکر آسماں
اِس بیاہ کی نوید سے ہے اِس قدر سرور ۔۔۔ ہے پیر۔ پر جوانوں سے ہے بہتر آسماں
پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن ۔۔۔ مقدور کیا! کہ ٹھہر سکے دم بھر آسماں
فردِ حساب صرف سے اِس بیاہ کے ہو کم ۔۔۔ گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں

خواجہ الطاف حسین حالی

ہے عید یہ کس جشن کی یارب۔ کہ سراسر ۔۔۔ ہے جوبلی ہی جوبلی اِک اِک کی زباں پر
یہ عہد کہ گذرے ہیں برس جسکو پچاس اب ۔۔۔ ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر
وہ دَورِ تعصب تھا۔ یہ ہے دورۂ اخلاق ۔۔۔ وہ جنگ کا موجد تھا۔ یہ ہے صُلح کا رہبر

اِس دورِ خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے
تھی جن کی جہاں سوز لپٹ آگ سے بڑھ کر

اِس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کئے قطع
جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر

بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب
جو لوگ روا رکھتے تھے خونریزیٔ دختر

جب بیٹیوں نے زندگی اِس طرح سے پائی
دی زندگی اِک اَور اُنھیں علم پڑھا کر

اِس عہد نے کی آ کے غلاموں کی حمایت
انساں کو نہ سمجھا کسی انسان سے کمتر

دی اِس نے مٹا ہند سے یوں رسمِ ستی کی
گویا وہ ستی ہو گئی خود عہدِ کہن پر

نابود کیا اِس نے زمانہ سے ٹھگی کو
اِک قہر تھا اللہ کا جو نوعِ بشر پر

اِس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ
مظلوم نہ اب بیل۔ نہ گھوڑا ہے۔ نہ خچر

اے نازشِ برطانیہ! اے فخرِ بزرگ!
اے ہند کے گلّہ کی شباں ہند کی قیصر

سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گذرا
محمود۔ نہ تیمور۔ ہنیبل۔ نہ سکندر

تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا
اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخّر

بند اپنے فرائض میں مسلماں ہیں۔ نہ ہندو
معمور مساجد ہیں۔ تو آباد ہیں مندر

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا
سنکھ اَور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

گو منّتِ قیصر سے ہے ہر قوم گرانبار
احسان مگر اسلام پہ ہیں اِس کے گراں تر

اب ہند میں کشمیر سے تا راس کماری
ہر قوم کے ہیں پیرو جواں متفق اِس پر

اُمید نہیں ہند کے راحت طلبوں کو
راحت کی کسی سایہ میں بجز سایۂ قیصر

گر برکتیں اِس عہد کی سب کیجیے تحریر
کافی ہے نہ وقت اُس کے لئے اور نہ دفتر

ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جب تک
آزادی و انصاف حکومت کے ہیں رہبر

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

قطعات

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱) بے تمیزی ابنائے زماں

ازرہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا — تُہے وجود اے مبتذل! تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کس میں ہیں اور قدر و قیمت تیری ہیچ — تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بنجائے تو کیا! — امتحاں کے وقت کُھل جاتا ہے سب تیرا بھرم"
مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا — "گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم!
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز — ہیں مبصر ایسے اس بازار ناپرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں — تجھ سے اے الماس! لیکن اچھے پڑتے ہیں ہم"

(۲) جس قوم میں افلاس ہو اُس میں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اِسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا؟ — جب کرتے ہو تم کرتے ہو مُسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور — جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اِسراف بھی مذموم ہے۔ پر بخل سے کمتر — ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے "نہ پوچھو سبب اس کا — یاروں کے لئے ہے یہ بیاں موجب رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اُس وقت — جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت توانگر — پھر اُس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال — گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی — پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

(۳) بے اعتدالی

تم اے خود پرستو! طبیعت کے بندو! — ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز — جدھر ڈھل گئے۔ ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت — تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو۔ تو اُٹھو نہ جب تک — کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر — تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا۔ تو جانو — کہ بس ٹھن گئے عزمِ جنگِ تتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر — تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تم کو کھانے کا چسکا۔ تو سمجھو — کہ چھوڑینگے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ۔ تو پی جاؤ اِتنی — رہیں پانوں کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بیحد۔ جو پینا تو اَت گت — غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱)

اے شہنشاہِ فلک منظر و بے مثل و نظیر! — اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل!
پانوں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ اِلہام — تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بسخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ — بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زُہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اِصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحّم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بخت ناساز نے چاہا۔ کہ نہ دے مجکو اماں
چرخِ کجباز نے چاہا۔ کہ کرے مجکو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

فکر میری گہراندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۲)

اے شاہ جہانگیر! جہاں بخش! جہاں دار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدہ کو۔ سو بھی باشارت

ممکن ہے؟ کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں۔ جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مُریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے اگرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل — ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر؟ — قاصر ہے حکایت میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج۔ اور وہ دن ہے۔ کہ ہوئے ہیں — نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجھکو شرفِ مہر جہانتاب مبارک — غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

شیخ ابراہیم ذوق

(۱)

خسروا! سُن کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز — آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج
خبرِ عیش تری دے ہے چمن کو جا کر — زرِ گل پیکِ صبا پائے نہ کیونکر پارنج
بادۂ جوش جوانی کی ہے گویا اک موج — تنِ پیرانِ کہن سال پہ ہر چین و شکنج
چند قطرے سے نہیں شبنم کے وہ بلکہ گہر — لگے ہمت سے تری گوہرِ شہوار کے گنج
حسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش — دستِ حاتم ہیں بجا ہے۔ کہ جو دیں تیغ و ترنج
شش جہت پر ہے جو غالب ترا سرپنجۂ امن — فتنے کو اُٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیا شش و پنج
نہ بجھے آب سے آتش۔ نہ خس آتش سے جلے — ایک سے ایک موافق۔ کہ مرنجان و مرنج
تیرے منصوبے کے تابع ہیں سب احکامِ نجوم — صفحۂ تقویم کا گویا ہے بساطِ شطرنج
لایا ہے معنیِ رنگیں سے یہ لعلِ خوش رنگ — ذوق جو مدح و ثنا میں ہے تری گوہر سنج
خسروا! ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم رنگ — رنگ نوروز جو ہے اب سے برنگ نارنج

بزمِ رنگیں میں تری رنگِ طرب ہو ہر روز
اور تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

مسدسات

میر ببر علی انیس

میر ببر علی نام۔ انیس تخلص۔ میر حسن دہلوی کے نامور پوتے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی ان کی چاردانگ ہند میں مشہور و مسلم تھی فصاحتِ بیان اور لطافتِ محاورہ میں ان کا کلام اُس پایہ بلند پر پہنچا ہے کہ جس کی نظیر نہیں۔

صفتِ صبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں مرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا۔ وہ فضا۔ وہ نور خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو۔ ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخیِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار وہ بارور درخت۔ وہ صحرا۔ وہ سبزہ زار

شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار | پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

غریب الوطنی

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں | راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہوں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں | پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہِ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد | جاتی نہیں افسردگیٔ خاطرِ ناشاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد | ہر گام پہ دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر | منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر
جب ہو سفر خوف و پریشانیٔ خاطر | شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر

ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے
رہ جائے پسِ قافلہ تھک کر تو غضب ہے

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے | منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے | ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

واماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی | تھک کر بھی جو بیٹھے تو اٹھاتا نہیں کوئی

صفت تیغ

(۱)

تھا صورتِ آئینہ تمام اُس کا بدن صاف — خوں پیتی تھی - پر دیکھو تو منھ صاف دہن صاف
چلتی تھی جو سن سن - یہ نکلتا تھا سخن صاف — ہٹوں میں تو وہ جا دب - کہ کر دیتی ہوں صف صاف

نا اہل ہیں - نامرد ہیں ناپاک ہیں اعدا
میں برق غضب ہوں خس و خاشاک ہیں اعدا

مغفر سے جھلم کاٹ کے گردن میں در آئی — گردن سے سرکتا تھا - کہ جوشن میں در آئی
جوشن سے گذرنا تھا - کہ بس تن میں در آئی — تن سے ابھی اُتری تھی کہ توسن میں در آئی

بچتا کوئی کیا تیغ قضا رنگ کے نیچے
اک برق غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

پیری کبھی - گہ خوں میں نہا کر نکل آئی — ٹھہری کبھی - غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو ندہ - موج میں جا کر نکل آئی — منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی

کیا ڈر اُسے طوفاں کا - جو چالاک ہو ایسا
جب بارہ پہ دریا ہو - تو پیراک ہو ایسا

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی - عجب طرح کا دم تھا — تیزی پہ جسے ناز تھا - سر اُس کا قلم تھا
ناگن میں نہ یہ زہر - نہ افعی میں یہ سم تھا — یہ فتح کی جویا تھی - قدم اسطے خم تھا

بد اصل تکبر کے سخن سہتے ہیں اکثر
جو صاحبِ جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

(۲)

بجلی سی جو گر کر صفِ کفار سے نکلی — آواز بزن تیغ کی جھنکار سے نکلی

گہ ڈھال میں ڈوبی۔ کبھی تلوار سے نکلی
درآئی جو پیکاں میں۔ تو سوفار سے نکلی

تھے بند خطا کاروں پہ در امن و اماں کے
چلّے بھی چھپے جاتے تھے گوشوں میں کماں کے

افلاک پہ چمکی کبھی۔ سر پہ کبھی آئی
کوندی کبھی جوشن پہ۔ سپر پر کبھی آئی
گہہ پڑ گئی سینہ پہ۔ جگر پر کبھی آئی
تڑپی کبھی پہلو پہ۔ کمر پر کبھی آئی

طے کر کے پھری۔ کونسا حصہ تھا فرس کا؟
باقی تھا جو کچھ کاٹ۔ وہ حصہ تھا فرس کا

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
ندی اُدھر اک خوں کی۔ اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو۔ لعل اُگلتی ہوئی آئی

ہیرا تھا بدن۔ رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو۔ پیٹ جواہر سے بھرا تھا

سر پٹکے۔ تو موج اُس کی روانی کو نہ پہنچے
قلزم کا بھی دھارا ہو۔ تو پانی کو نہ پہنچے
بجلی کی تڑپ شعلہ فشانی کو نہ پہنچے
خنجر کی زباں تیز زبانی کو نہ پہنچے

دوزخ کے زبانوں سے بھی آنچ اُسکی بُری تھی
برچھی تھی۔ کٹاری تھی۔ سروہی تھی چھری تھی

موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی
دم خم بھی۔ لگاوٹ بھی صفائی بھی۔ ادا بھی
اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی۔ پانی بھی۔ ہوا بھی
امرت بھی۔ ہلاہل بھی۔ مسیحا بھی۔ قضا بھی

کیا صاحبِ جوہر تھی۔ عجب ظرف تھا اُس کا
موقع تھا جہاں جسکا۔ وہیں صرف تھا اُس کا

ہر ڈھال کے پھولوں کو اڑاتا تھا اجل اس کا — تھا لشکرِ باغی میں ازل سے عمل اس کا
ڈر جاتی تھی منھ دیکھ کے بزدل اجل اس کا — تھا قلعۂ چار آئنہ گویا محل اس کا
اس در سے گئی۔ کھول کے وہ در نکل آئی
گہہ صدر میں بیٹھی۔ کبھی باہر نکل آئی

تیروں پہ گئی برچھیوں والوں کی طرف سے — جا پہنچی کمانداروں پہ بھالوں کی طرف سے
پھر آئی سواروں کے رسالوں کی طرف سے — منھ تیغوں کی جانب کیا ڈھالوں کی طرف سے
بس ہو گیا دفتر نظری نام و نسب کا
لاکھوں تھے تو کیا! دیکھ لیا جائزہ سب کا

پہنچی جو سپہ تک۔ تو کلائی کو نہ چھوڑا — ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو۔ شرارت کو۔ لڑائی کو نہ چھوڑا — تیزی کو۔ رکھائی کو۔ صفائی کو۔ نہ چھوڑا
اعضا سے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

چار آئنہ والوں کو نہ تھا جنگ کا یارا — جو تنگ تھے سینے۔ تو کلیجہ تھا دو پارا
کہتے تھے زرہ پوش نہیں تاب خدارا — بچ جائیں تو جانیں کہ ملی جان دوبارا
جوشن کو سنا تھا۔ کہ حفاظت کا محل ہے
اس کی نہ خبر تھی۔ کہ یہی دامِ اجل ہے

بد کیش۔ لڑائی کا چلن بھول گئے تھے — ناوک فگنی تیر فگن بھول گئے تھے
سب حیلہ گری عہد شکن بھول گئے تھے — بیہوشی میں ترکش کے دہن بھول گئے تھے
معلوم نہ تھا جسم میں جاں ہے کہ نہیں ہے — چلاتے تھے قبضہ میں کماں ہے کہ نہیں ہے

صفت اسپ

(۱)

لکھتا ہے ادہم قلم اب سُرعتِ عقاب — نعل اُس کے ماہِ نو ہیں۔ تو سُم رشکِ آفتاب
پستی میں سَیل ہے تو بلندی میں ہے سحاب — سُرعت میں برق۔ گرم روانی میں جوئے آب

اُڑنے میں اُس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے
اِک شور تھا۔ قدم نہیں دریا کی موج ہے

نازک مزاج۔ نسترن اندام۔ تیز رَو — گردوں مسیر بادیہ پیما و برق دَو
اُس کا نہ اِک قدم۔ نہ زغندیں ہرن کی سَو — دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے نہ جَو

رفتار میں ہوا تھا۔ اشارے میں برق تھا
سُرعت میں کچھ کمی تھی۔ نہ چھَل بل میں فرق تھا

صرصر سے تُند۔ بُو سے سُبکرو۔ ہوا سے تیز — چالاک فہم و فکر سے۔ ذہنِ رسا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر عقاب و ہما سے تیز — جانے میں اُڑ کے ہُدہُد شہرِ سبا سے تیز

ذی جاہ تھا۔ سعید تھا۔ فیروز بخت تھا
رہوار کیا! ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ اِدھر آیا۔ اُدھر گیا — چمکا۔ پھرا۔ جال دکھایا۔ ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑ گیا۔ برچھیوں میں بے خطر گیا — برہم کیا صفوں کو۔ پروں سے گذر گیا

گھوڑوں کا تن بھی تاپ سے اُس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی۔ کہ سر دہی کا وار تھا

(۲)

کوتاہ و گردِ و صاف۔ کنوتی کمر کفل — کیا خوش نما کشادگی سینہ و بغل!

سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل — پھرتا تھا اس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل

راکب نے سانس لی۔ کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تارِ نفس بھی اُس کے لئے تازیانہ تھا

وہ جست و خیز و سُرعت و چالاکیٔ سمند — سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اُسکے جوڑ بند
سُم قُرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند — نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سر بلند

گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ۔ اُڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی۔ کہ مُڑ گیا

آہو کی جست۔ شیر کی آمد۔ پری کی چال — کبکِ دری خجل۔ دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سُبکروی میں قدم کے تلے نہال — اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی۔ کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا۔ کبھی رہوار بن گیا — آیا عرق۔ تو ابرِ گہربار بن گیا
گہ قطب۔ گاہ گنبدِ دوّار بن گیا — نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا

حیراں تھے اُس کے گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

ایک مثمّن

از مؤلّف

کیفیت قلعۂ اکبر آباد

یارب! یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے
یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمیٔ بزم کی فریاد و فغاں ہے
یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دورِ گذشتہ کی مہابت کا نشاں ہے
بانیٔ عمارت کا جلال اِس سے عیاں ہے
اُڑتا تھا یہاں پرچمِ جاہیٔ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیٔ اکبر

باہر سے نظر ڈالئے اِس قلعہ پہ یکچند
گویا کہ ہے اک سورما۔ مضبوط۔ تنومند
برپا ہے لبِ آبِ جمن صورتِ الوند
یا ہند کا رجپوت ہے۔ یا ترکِ سمرقند
کیا بارۂ سنگین کا پہنا ہے قزآگند!
ریتی کا قزآگند یہ باندھا ہے کمربند
مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
اربابِ تمرّد کے لئے بُرج ہیں سرکوب

تعمیرِ درِ قلعہ بھی البتہ ہے موزوں
پُرشوکت و ذی شان ہے اُس کا رُخِ بیروں
کی ہے شعرائے صفتِ طاقِ فریدوں
معلوم نہیں اِس سے وہ کمتر تھا کہ افزوں
گو ہمسرِ کیواں ہے۔ نہ ہم پلۂ گردوں
محراب کی ہیئت سے ٹپکتا ہے یہ مضموں

پیلان گراں سلسلہ با ہودجِ زرّیں
اس در سے گذرتے تھے بصد رونق و تزئیں

اکبر سا کبھی مخزنِ تدبیر یہاں تھا
یا طنطنۂ دورِ جہانگیر یہاں تھا
یا شاہجہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا
یا مجمعِ ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا
القصہ کبھی عالمِ تصویر یہاں تھا
دُنیا سے سوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا

بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر
سجتے تھے جشن ملوکانہ اسی قصر کے اندر

وہ قصرِ معلّیٰ کہ جہاں عام تھا دربار
آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
و سقفِ زر اندود ہے مانندِ چمن زار
وہ فرش ہے مرمر کا گر چشمۂ انوار
اب یاں تمکِ نقیب اُس میں نہ جاؤش کی للکار
سرہنگ کمربستہ - نہ وہ مجمعِ حُفّار

کہتا ہے "کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں قبلہ گہِ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیّت کو مرا وقر تھا منظور
نافذ تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور
شاہانِ مُعاصر کا معیّن تھا یہ دستور
کرتے تھے سفیرانِ ذوی القدر کو مامور
تا میری زیارت سے کریں چشم کو پُر نور
آوازہ مری شان کا پہنچا تھا بہت دُور

اکناف جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر - وہ دیہیم - وہ سامان کہاں ہیں؟
وہ شاہ - وہ نوئین - وہ خاقان کہاں ہیں؟
وہ بخشی و دستور - وہ دیوان کہاں ہیں؟
خُدّامِ ادب اور وہ دربان کہاں ہیں؟

وہ دولتِ مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں؟
فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں؟

سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس!
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بارگہِ خاص کی پاکیزہ عمارت
تاباں تھے جہاں نیّرِ شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت
آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت
جوں تختۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت
سیاح کیا کرتے ہیں اب اُس کی زیارت

کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دَر و دل کا
"تھا مخزنِ اسرار یہی تاجوروں کا"

اورنگِ سیہ رنگ جو قائم ہے لبِ بام
بوسہ جسے دیتا تھا سرِ اکبر [illegible]
اشعار میں ثبت اُس پہ جہانگیر کا ہے نام
شاعر کا قلم اُس کی بقا لکھتا ہے مدام
پر صاف نظر آتا ہے کچھ اور ہی انجام
سالم نہیں چھوڑے گی اُسے گردشِ ایام

فرسودگیٔ دہر نے شق اب تو کیا ہے
آئندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں کس لئے خاموش ہے او تختِ جگر ریش؟
کس غم میں سیہ پوش ہے کیا سوگ ہے درپیش؟
کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورتِ درویش؟
جوگی ہے ترا انگ کہ صوفی ہے ترا کیش؟
بولا کہ زمانہ نے دیا نوش کبھی نیش
صدیاں مجھے گذری ہیں بہاریں تھیں کم و بیش

صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظم کے قدم میں نے چھوئے تھے

رنگیں محل اور برجِ مثمن کا وہ انداز
صنعت [illegible] سرفراز

یاں مطربِ خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز
کہ ہند کی دھرپت تھی کبھی نغمۂ شیراز
اب کون ہے؟ بتلائے جو کیفیتِ آغاز
زنہار! کوئی جاہ و حشم پہ نہ کرے ناز

جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ برج منوّر
اب اُن کا مقابر میں تہ خاک ہے بستر

اُس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے - نہ اسباب
فوّارے شکستہ ہیں - تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جام بلوریں ہیں - نہ وہ گوہرِ نایاب
وہ چلمنِ زرتار - نہ وہ بسترِ کمخواب
ہنگامہ جو گذرا ہے - سو افسانہ تھا یا خواب
یہ معرضِ خدّام تھا - وہ موقفِ حجّاب

وہ بزم نہ وہ دَور - نہ وہ جام - نہ ساقی
ہاں طاق و رواق اور در و بام ہیں باقی

مستور سراپردۂ عصمت میں تھے جو گُل
سو دودۂ تُرک اور مغل ہی سے نہ تھے کُل
کچھ خیری فرغانہ تھے کچھ لالۂ کابل
کچھ مولسری ہند کی اُن میں گئی رِل مِل
تعمیر کے انداز کو دیکھو یہ تاملّ
تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمّل

سیّاح جہاندیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالاتِ مرکّب کی ہے تصویر

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد
ہوتی تھی تو لاوان میں کیا کیا دہش و داد
زنجیرِ عدالت بھی ہوئی تھی یہیں ایجاد
جو رسمِ شہنشاہ میں پہنچاتی تھی فریاد
وہ نورجہاں اور جہانگیر کی اُفتاد
اس کاخِ ہمایوں کو بہ تفصیل ہے سب یاد

ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اس کی مورّخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھئے وہ مسجد و حمّام زنانہ — وہ نہر۔ وہ حوض۔ اور وہ پانی کا خزانہ
صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ — ہے طرزِ عمارت سے عیاں شانِ شہانہ
کیا ہو گئے وہ لوگ! کہاں ہے وہ زمانہ — ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ
چغتائیہ گلزار کی یہ فصلِ خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نور جہاں ہے

وہ قصر جہاں جودھ پوری رہتی تھی بائی — تھی دولت و ثروت نے جہاں دھوم مچائی
دیکھا اُسے جاکر۔ تو بُری گت نظر آئی — صحنوں میں جمی گھاس۔ تو دیواروں پہ کائی
گویا در و دیوار یہ دیتے ہیں دُہائی — "ممکن نہیں طوفانِ حوادث سے رہائی"
جس گھر میں تھے نسرین و سمن یا گُل و لالہ
اب نسلِ ابابیل میں ہے اُس کا قبالہ

وہ مسجدِ زیبا۔ کہ ہے اِس بزم کی دُلہن — خوبی میں یگانہ ہے۔ و لے سادہ و پُرفن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن — موتی سے ہیں دالان۔ تو ہے دود سا آنگن
کافور کا تودہ ہے۔ کہ الماس کا معدن — یا فجر کا مطلع ہے۔ کہ خود روز ہے روشن
بلّور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس

ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے — سانچہ میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے — مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
نے شمع نہ فانوس۔ نہ بتی۔ نہ دیا ہے — ہاں! چشمۂ خورشید سے آب اِس نے پیا ہے
اب چلئے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور — نظّارہ کی دو مجکو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اُس نے کہانی
اُن حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی
اُس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی میں نشانی
کچھ حالتِ موجودہ باین سحر بیانی
فوّاروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی

تسبیح - نہ تہلیل - نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفلِ گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و اُمرا کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکرِ خدا کا
اک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عزّ و علا کا
مجمع تھا کبھی یاں صُلحا و عُلما کا
ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
جو کچھ تھا گذر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا

ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین
یا دُھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکین

وہ دَور ہے باقی نہ وہ ایّام و لیالی
ہر کوشک و ایوان - ہر اک منزلِ عالی
آقا نہ خداوند - اہالی - نہ موالی
جو واقعہ سچّی تھا سو ہے آج خیالی
عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
جُز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی

یہ جملہ محلّات - جو سنسان پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کیے حیران کھڑے ہیں

جب کُند ہوئی دولتِ مغلیہ کی تلوار
تب ایک جو تھا لشکرِ انگلش کا سپہدار
یہ بارہ و برج اور یہ ایوان - یہ دیوار
اور لوٹ لیا جاٹ نے ایوانِ طلا کار
افواجِ مخالف سے ہوا برسرِ پیکار
کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے گولوں کی [illegible]

ہے گردشِ ایّام کے حملوں کی [illegible]

پھر قلعۂ اکبر ہی میں بھا گیا بر سرِ خاب!

آخر کو مخالف کی شکستہ ہوئی قوت   اونچا ہوا سرکار کے اقبال کا رایت
لہرانے لگا پھر علمِ امن و حفاظت   آثارِ قدیمہ کی لگی ہونے مرمت
یہ بات نہ ہوتی۔ تو پہنچتی وہی نوبت   دیوار گری آج۔ تو کل بیٹھ گئی چھت،

حکّامِ زماں کی جو نہ ہوتی نگرانی
رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلیہ نشانی

اربابِ خرد چشمِ بصیرت سے کریں غور   اکبر کی بنا اِس سے بھی پایندہ ہے اِک اور
سردی کی جفا جس پہ نہ گرمی کا چلے جور   ہر چند گذر جائیں بہت قرن۔ بہت دور
برسوں یونہیں پھرتے رہیں برجِ حمل و ثور   اُس میں نہ خلل آئے کسی نوع کسی طور

انجنیر دل کی بھی مرمت سے بری ہے
وہ حصن حصیں کیا ہے؟ فقط ناموری ہے

اے اکبر ذیجاہ! تری عزت و تمکیں   محتاجِ مرمت ہے۔ نہ مستلزم تزئیں
کندہ ہیں دلوں میں تری اُلفت کے فرامیں   ہے تیری محبت کی بنا اک دشتر روئیں
گو حملۂ بے سود کرے بھی کوئی کم بیں   زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تحسیں

پشتوں سے رعایا میں یہ آئینِ وراثت
قائم چلی آتی ہے ترے نام کی عظمت

بکرم کی سبھا کو تری صحبت نے بھلایا   اور بھوج کا دورہ تری شہرت نے بھلایا
ارجن کو تری جرأت و ہمت نے بھلایا   کسریٰ کو ترے دورِ عدالت نے بھلایا
اسکندر و جم کو تری شوکت نے بھلایا   بچھلوں کو غرض تیری عنایت نے بھلایا!

آتے ہیں زیارت کو تو اب تک ہے یہ معمول
زائر تری تُربت پہ چڑھا جاتے ہیں دو پھُول

ہو کہنہ و فرسودہ ترا قلعہ تو کیا غم
بھرتا ہے ہر اک فرقہ محبت کا ترِی دم
رتبہ ہے ترا ہند کے شاہوں میں مسلّم

شہرت ہے ترے نام کی سو قلعوں سے محکم
لکھتے ہیں مورخ بھی تجھے اکبرِ اعظم
یہ فخر ترے واسطے زِنہار نہیں کم

گو خاک میں مِل جائے ترے عہد کی تعمیر
ہے کتبۂ عزّت ترا ہر سینہ میں تحریر

رباعیات

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱)

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال	مہماں کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع - جس کو نہ کبھی	اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

(۲)

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار	بد ظن نہ ہو عیب اُس میں ہیں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کرکے نظر	کر حسن و جمال کا نہ اُس کے اِنکار

(۳)

ہیں یار رفیق - پر مصیبت میں نہیں	ساتھی ہیں عزیز - لیک ذلت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے عبث	جو نوعِ بشر کی خود جبلت میں نہیں

(۴)

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر	آتا نہیں فرق اس کے سوا اُن میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا	جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

از مؤلف

(۱)

تیزی نہیں منجملۂ اوصافِ کمال	کچھ عیب نہیں - اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی	ہاں! راہِ طلب میں شرط ہے استقلال

(۲)

گر نیک دلی سے کچھ بھلائی کی ہے — یا بد منشی سے کچھ بُرائی کی ہے
اپنے ہی لئے ہے سب نہ اوروں کے لئے — اپنے ہاتھوں نے جو کمائی کی ہے

(۳)

دین اور دُنیا کا تفرقہ ہے مہمل — نیت ہی پہ موقوف ہے تنقیح عمل
دُنیا داری بھی عین دین داری ہے — مرکوز ہو گر رضائے حق عزّ و جل

(۴)

دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا ہرگز — ڈھونڈھا۔ تو کہیں پتا نہ پایا ہرگز
کھونا پانا ہے سب فضولی اپنی — یہ خبط نہ ہو مجھے خدایا ہرگز

امیر مینائی

(۱)

گھر کھُدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے — روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر — یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

(۲)

بالفرض حیات جاودانی تم ہو — بالفرض۔ کہ آبِ زندگانی تم ہو
ہم سے نہ ملو۔ تو خاک سمجھیں تم کو — لیں نام نہ پیاس کا۔ جو پانی تم ہو

مرزا غالب

(۱)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے — تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ — ہے صفر - کہ افزائش اعداد کرے

(۲)

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے؟ — بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار — فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

میر انیس

(۱)

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے — ہر گُل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی - تو کہا — "رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے"

(۲)

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے — جو چیز ہے کم اُسے رسا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب — غافل! اِس زندگی کو کیا سمجھا ہے

(۳)

ہشیار! کہ وقتِ ساز و برگ آیا ہے — ہنگامِ یخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاجِ عصا ہوئے تو پیری نے کہا — "چلیے - اب چوبدارِ مرگ آیا ہے"

(۴)

گلشن میں پھروں - کہ سیرِ صحرا دیکھوں — یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

(۵)

انساں ہی کچھ اس دور میں پامال نہیں — سچ ہے کوئی آسودہ و خوش حال نہیں

اندیشۂ آشیان و خوف صیاد | مرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

(۶)

ہر طرح سے یہ سرائے فانی دیکھی | ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا | جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

میر تقی

(۱)

ہم میر سے کہتے ہیں۔ نہ تو رو یاکر | ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویاکر
پایا نہیں جاتے کا وہ دُرِّ نایاب | کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویاکر

(۲)

راضی ٹک آپ کو رضا پر رکھیئے | مائل دل تنگ کو قضا پر رکھیئے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میرؔ | سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھیئے

(۳)

ملئے اُس شخص سے جو آدم ہووے | ناز اُس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے اک خلق | خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

تمام شد حصۂ نظم